
پانی کا قطرہ
سونے کا ذرہ؟

پانی کا قطرہ
سونے کا ذرہ

منتخب ترکمانی افسانے

دارالاشاعت ترقی • تاشقند شاخ
۱۹۸۰ء

فہرست

ترجمہ: رحمان بیردی محمدجانف
نظرثانی: منظر سلیم
ڈیزائن: لی الیکساندر

НАПЕРЕКОР ПУСТЫНЕ
Рассказы туркменских писателей

На языке урду

سوویت یونین میں شائع شدہ

H $\frac{70500-600}{014(01)-80}$ 666—80 4702010200

پیش لفظ

ریگستان نے انسان کو صدیوں سے عاجز کر رکھا تھا۔ وہ انسان کو بےگھر کر دیتا، اس کے چولھے کو ریت سے بھر دیتا، اس کو روٹی اور پانی سے محروم کر دیتا، یہاں تک کہ اکثر اس کی سب سے عزیز چیز، اس کی زندگی ھی اس سے چھین لیتا تھا۔

وسط ایشیا کے عوام کا ایک اور جانی دشمن بھی تھا۔ بڑا لالچی، ظالم اور مکار قسم کا دشمن۔ یہ تھا امیروں کا طبقہ۔ یہ دشمن غالباً ریگستان سے بھی زیادہ طاقتور اور اس سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ ریگستان سے غریبوں کے لئے جو کچھ بچتا وہ امیروں کے ھتھے چڑھ جاتا تھا۔

لیکن عظیم اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کے آتے ھی وسط ایشیا کے عوام کی زندگی کی کایاپلٹ ھو گئی۔ امیروں کے جبر و تشدد کا خاتمہ ھو گیا۔ ناانصافی مٹ گئی۔ ازبیک،

نئی زندگی سے، یہاں پیدا ہونےوالے نئے انسان سے روشناس کرائے گی۔

زیرنظر مجموعے میں سوویت وسط ایشیا کی چار جمہوریاؤں میں سے ایک یعنی ترکمانستان کے ادیبوں کی تخلیقات شامل ہیں۔ ہم نے ترکمان ادیبوں کی تخلیقات کو فوقیت اس لئے دی ہے کہ ترکمانستان وسط ایشیا کا وہ علاقہ ہے جہاں سوویت نظام حکومت کی، نئے نظام حیات کی برکتیں زیادہ سے زیادہ واضح طور پر سامنے آئی ہیں۔ اکتوبر انقلاب سے پہلے سب سے زیادہ غریبی اور جہالت اسی ترکمانستان کے کسانوں میں تھی، پانی کی سب سے زیادہ قلت اسی ترکمانستان میں رہتی تھی، اسی ترکمانستان کی حدود میں قراقم ("کالی ریت") کا وہ عظیم ریگستان پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہاں کے عوام بےشمار مصیبتیں برداشت کرتے آئے تھے۔

ترکمانی زبان میں نثری ادب کو وجود میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ یہ سوویت نظام حکومت کے دوران ہی وجود میں آیا ہے۔ ترکمانی نثر کے بانیوں اور ترکمان سوویت ادب میں کلاسیکی اہمیت کے حامل ادیبوں میں نورمراد سراخانوف (١٩٠٦ء — ١٩٤٤ء) بھی ایک تھے۔ وہ ایک ایسے غریب کسان کے بیٹے تھے جس کے پاس اپنی زمین تک نہیں تھی مگر اکتوبر انقلاب آیا، سوویت حکومت بنی اور ان کی قسمت جاگ اٹھی۔ زیر نظر مجموعے میں "ایک کتاب" نامی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کا شمار ان کی بہترین کہانیوں

ترکمان، قرغیز اور تاجک عوام اپنی قسمتوں کے خود مالک ہو گئے۔ انھوں نے اپنے علاقوں میں کارخانے تعمیر کئے، اسکول اور اعلا تعلیمی ادارے قائم کئے۔ اس سرزمین میں چار سوویت سوشلسٹ جمہوریائیں وجود میں آئیں جو برادرانہ اتحاد کے رشتوں میں منسلک ہو گئیں۔ ان چاروں جمہوریاؤں کے اجتماعی اور ریاستی فارموں میں آج جدیدترین قسم کی لاکھوں مشینیں موجود ہیں۔ انسانوں کے مصمم عزم اور ارادے سے مغلوب ریگستان بھی پسپا ہوتا جا رہا ہے۔ ریگستان کے سینے کو چیر کر ایک عظیم نہر نکالی گئی ہے، وی۔آئی۔ لینن کے نام سے منسوب نہر قراقم جس نے زمین کی صدیوں پرانی پیاس کو بجھا دیا ہے۔

اب اس سرزمین کا مالک خود انسان بھی بدل گیا ہے۔ اس کو اپنی طاقت اور توانائی کا احساس ہو گیا ہے۔ اس کا دل جوش اور ولولے سے بھر گیا ہے۔ وہ اب ریگستان پر حکم چلانے کے قابل ہو گیا ہے۔

جیسا کہ عام دستور ہے، نئی زندگی کی گود میں نئے نغمے بھی جنم لیتے ہیں۔ آج وسط ایشیا کے طول و عرض میں ایسے نغمات گونج رہے ہیں جن میں نئی قسم کے سورماؤں کے گن گائے جاتے ہیں۔ یہ نئے سورما ادب میں بھی آ گئے ہیں۔

زیر نظر کتاب اردو قارئین کو سوویت وسط ایشیا کی

اس میں بننےوالی عظیم لینن نہر ایسے ھی موضوعات ھیں۔ مصنف کی زندگی بچپن ھی سے اس صحرائے عظیم سے وابستہ رھی ھے۔ پانی کی تلاش میں ریگستان کے بہت سے لوگ اپنے علاقے چھوڑ کے آمودریا کے کنارے پر جا بسے تھے۔ ان میں بیردی‌نظر خدائےنظروف کا خاندان بھی شامل تھا۔ چنانچه مصنف کے بچپن ھی کے تجربات زندگی ان کے مشہور ناول "صحرا کے باشندے" کے لئے بنیاد بنے۔ اس ناول کے لئے مصنف کو جمہوریه کے ریاستی انعام سے نوازا گیا۔ پھر انہوں نے ایک ناولٹ "قراقم کے آسمان تلے" تحریر کیا جس میں ان لوگوں کے کردار اجاگر کئے جنہوں نے صحرا میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر نہر عظیم کا راسته متعین کیا تھا۔ اس ناولٹ کو بھی جمہوریائی انعام ملا ھے اور اسی کے کچھ ٹکڑے هم قارئین کے لئے پیش کر رھے ھیں۔

اس مجموعے کے ایک اور مصنف ھیں بیردی کیربابائیف (۱۸۹۴ء—۱۹۷۴ء)۔ ان کا شمار سوویت وسط ایشیا کے ممتازترین ادیبوں میں ھوتا ھے اور ان کی ادبی خدمات کی قدر و منزلت سوویت یونین کے ریاستی انعام سے کی گئی ھے۔ کیربابائیف متعدد علوم و فنون سے واقفیت رکھتے تھے اور ان کی معلومات کا دائرہ بےحد وسیع تھا۔ وہ ترکمانی نثری ادب کے بانیوں میں سے تھے۔ انہوں نے ھی ترکمانی ادب میں کہانی، عام قسم کے ناول اور کثیرپہلو سلسلہ‌وار ناول کی اصناف کو رائج کیا اور ان کو پختگی بخشی۔ بیردی کیربابائیف نے

میں کیا جاتا ھے۔ اس میں دکھایا گیا ھے کہ غریب اور دبے کچلے ہوئے کسانوں میں علم و آگہی کا کتنا اشتیاق ھے، وہ روشنی کی طرف کس طرح لپکتے ھیں، عظیم ترکمان شاعر محتوم‌قلی کی شاعری ان کے لئے کتنی کشش رکھتی ھے۔ وہ شاعری بہت بلندپایہ فن کا نمونہ ہونے کے ساتھ ھی ساتھ انہی غریب لوگوں کی زندگیوں کی بھی عکاسی کرتی ھے اس لئے ان کی سمجھ میں آ جاتی ھے۔ یہ کہانی بہت حد تک خود مصنف کی آپ بیتی ھے۔ بوڑھے ویل‌مراد آغا کے بیٹے پر جو کچھ بیتی ھے اسے خور مصنف کی روداد حیات سمجھئے۔

مجموعے کی اگلی کہانی کے مصنف مشہور ترکمان ادیب بیکی سیتاکوف بھی (۱۹۱۴ء-۱۹۷۹ء) ایک غریب کسان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اکتوبر انقلاب کی بدولت ھی انہیں اچھی تعلیم پانے اور مصنف بننے کا موقع ملا۔ سیتاکوف شاعر بھی تھے اور نثرنگار بھی۔ انہوں نے دو بڑے بڑے ناول ("برادران" اور "شاعر")، کئی ناولٹ اور بہت سی کہانیاں لکھی ھیں۔ انہوں نے مترجم کی حیثیت سے بھی کافی نام کمایا ھے اور شہرہ‌آفاق کلاسکیی ازبیک، روسی اور یوکرینی شعرا نوائی، پشکن اور شیفچینکو کی تخلیقات کا ترکمانی زبان میں ترجمہ کیا ھے۔

ہر مصنف کا اپنا کوئی نہ کوئی مرغوب و محبوب موضوع ہوتا ھے جس پر وہ بار بار قلم اٹھاتا رھتا ھے۔ بیردی‌نظر خدائےنظروف (سن پیدائش ۱۹۲۷ء) کے لئے صحرائے قراقم اور

کثیر الفاظ سے بہتر ہوتے
ہیں چند الفاظ اور چند الفاظ
میں بھی سچے الفاظ۔

ترکمانی کہاوت

زیادہ‌تر جن مسائل کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا ہے وہ ہیں وطن عزیز کا تبدل و تغیر، اس کی تعمیر نو اور سوویت انسان کے مزاج کی تشکیل۔

بیردی کیربابائیف نے نثر اور نظم کی مختلف اصناف میں طبع‌آزمائی کی ہے۔ ان کے ناولوں، ناولٹوں، ڈراموں اور مختصر اور طویل نظموں کو قارئین میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ مصنف کا آخری ناول "پانی کا قطرہ، سونے کا ذرہ" نہر قراقم کی تعمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم نے اسی ناول کے کچھ ابواب اس مجموعے میں شامل کئے ہیں۔ ان کو پڑھ‌کر قارئین بخوبی تصور کر سکیں‌گے کہ ترکمان عوام کے پانی سے متعلق صدیوں پرانے خواب کو کس طرح حقیقت میں بدل دیا گیا ہے، نہر عظیم کے معماروں نے کس تندھی اور جانفشانی سے محنت کی ہے اور جو لوگ نجی مفادات کے لئے نہر کے کار عظیم کے مفادات کو نقصان پہنچانے کی بات سوچتے تھے ان کو کس طرح روسیاہ کرکے چلتا کیا گیا۔ بیردی کیربابائیف کے اس ناول کو عصرحاضر کے مزدور طبقے سے متعلق بہترین ادبی تخلیقات میں سے ایک مانا گیا ہے اور اس کو سوویت یونین کی مرکزی ٹریڈ یونین کونسل اور سوویت یونین کی انجمن مصنفین کا انعام مل چکا ہے۔



نورمراد سراخانوف

ایک کتاب

(کہانی)

۱

ادبیات انسٹی‌ٹیوٹ نے مجھے پرانے قلمی نسخوں اور کتابوں کو تلاش کرنے کا کام سپرد کیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں جمهوریه کے متعدد علاقوں کا دورہ کیا۔ گھومتے پھرتے ایک دن میں مویشی پالنےوالوں کے ایک گاؤں میں جا نکلا جو قراقم ریگستان کے بیچ ایک نشیب میں بسا ہوا تھا۔

میرے وہاں پہنچتے ہی جیسا که اکثر ہوتا ہے، لوگ یه جاننے کے لئے بیقرار ہو اٹھے که میں کون ہوں، کہاں سے اور کس لئے آیا ہوں۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بتا دیا۔ میں مقامی اجتماعی فارم کے چیرمین کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے میزبان کو میرے مقصد کا علم ہوا تو انہوں نے بتایا که جیسی کتابوں کی مجھے تلاش ہے ویسی ہی ایک کتاب ان کے پڑوسی بوڑھے ویل‌مراد آغا* کے پاس موجود ہے۔

* آغا — بڑے بوڑھوں کے نام کے ساتھ احتراماً استعمال کرتے ہیں۔ اڈیٹر۔

دیکھتا رہا کہ میں کس طرح بیٹھتا ہوں اور کس انداز سے بات کرتا ہوں۔

"بیٹھو بھلے نوجوان۔ انگیٹھی سے ذرا اور قریب ہوکے بیٹھو نا۔" اس نے بڑی مہربانی سے مجھے بٹھایا اور نمدے پر میرے بیٹھتے ہی مجھ پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" یہ تھا اس کا پہلا سوال۔

میں نے بتایا۔ میرا جواب سن‌کر اس کی دلچسپی بڑھی اور اس نے بتایا کہ خود اسے کبھی عشق‌آباد جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ پھر اس نے پوچھا:

"اصل میں کہاں کے رہنےوالے ہو؟ تمہارا قبیلہ کہاں بستا ہے؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟ خود کیا کام کرتے ہو؟"

میں نے اپنی زندگی کا مختصر سا حال اسے سنا دیا اور پھر بتایا کہ مجھے ایک علمی ادارے نے بھیجا ہے۔ میں گاؤں گاؤں گھوم‌کر پرانی کتابیں تلاش کر رہا ہوں...

"یہ تو بہت اچھی بات ہے، نوجوان!" اس نے کہا۔

بوڑھے نے اپنی لمبی چوڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور غور سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا جیسے چہرے سے میرے دل کی بات معلوم کرنا چاہتا ہو۔ اس کی نگاہ میدانوں میں گھومنےوالے کسی شکاری کی آنکھوں کی طرح تیز اور چبھنےوالی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی بیوی سے کہا:

"ذرا ہماری کتاب کو تو لاؤ۔"

"بڑی نادر چیز ہے!" میرے میزبان نے بتایا۔ "سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے خود اس کو پڑھوا کر سنا ہے۔ ویل‌مراد آغا کہتے ہیں کہ "یہ کتاب سونے کے صندوق میں رکھنے لائق ہے۔" یہ کتاب انہیں ایک عجیب طریقے سے ملی ہے اور اس کے لئے کتنی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں! آپ یہاں کے کسی بھی آدمی سے پوچھیں، وہ بتا دے‌گا کہ یہ کتاب ویل‌مراد آغا کے ہاتھ کیسے لگی ہے۔ لیکن ایک بات آپ کو پہلے ہی سے بتا دوں۔ ویل‌مراد آغا اس کتاب پر جان دیتے ہیں اور اسے کسی قیمت پر بھی کسی کو دینے پر تیار نہ ہوں گے۔"

چیرمین کی باتوں سے مجھے یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کونسی کتاب ہے لیکن مجھ پر پوری طرح واضح ہو گیا کہ یہ "نادر الوجود چیز" اس کے مالک کے لئے کتنی عزیز ہوگی۔ تجربے سے میں جانتا تھا کہ ریگستانی گاؤں کے تمام باشندے کتابوں کی بہت زیادہ قدر کرتے ہیں۔ جنہیں خود پڑھنا لکھنا نہیں آتا وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم خود تو نہیں پڑھتے لیکن ہمارے بیٹے بڑے ہوں گے تو پڑھیں گے۔

میں کتاب کے مالک ویل‌مراد آغا کے گھر پہنچا اور اس کو گھر ہی میں پایا۔ وہ اڈھیر عمر کا آدمی تھا جسے بوڑھا کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ ہٹا کٹا جسم اور سینے پر پھیلی ہوئی خوبصورت داڑھی۔ دیکھنے میں بڑا نیکدل نظر آتا تھا۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ خاص بات صرف یہ تھی کہ وہ غور سے

که خطاط بڑا ھنرمند تھا اور اس نے اپنا کام بڑی لگن اور محنت سے کیا تھا۔ ھر سطر پر الفاظ برابر برابر فاصلے سے ایسے سلیقے سے سجے ھوئے تھے جیسے وہ الفاظ نہیں مٹر کی پھلی کے دانے ھوں۔ صاف جھلکتا تھا کہ کتاب خوب پڑھی گئی ھے۔ صفحوں کے کنارے کافی گھس اور پھٹ گئے تھے۔ ان کے نیچےوالے کونوں میں لوگوں کی انگلیوں کے کالے کالے چکنے نشان پڑ گئے تھے۔ شاید اس کتاب کی سطور پر بیسیوں سال سے لوگوں کی انگلیاں پھرتی آئی تھیں اور شاید سو دو سو آدمی اس کو پڑھ چکے تھے۔

میں نے جلدی جلدی کتاب کی ورق‌گردانی کی اور ادھر ادھر کچھ مصرعے پڑھ بھی لئے۔ یہ وھی چیز تھی جس کی وجہ سے میرے پیشے کے لوگ راتوں کو سو نہیں پاتے، گاؤں گاؤں بھٹکتے پھرتے ھیں، ھزاروں دروازوں پر دستک دیتے ھیں۔ یہ وھی چیز تھی جو ھزار مشکلوں سے ھاتھ آتی ھے۔ میں چاھے جتنے دن اور گھومتا پھرتا، چاھے جتنے مواضعات میں، جتنے خیموں میں جاتا، مجھے اس کے برابر کی کوئی اور چیز نہ ملتی۔ سب سے پہلے میں نے حتی‌الامکان کوشش کی کہ اس قلمی نسخے کی دریافت سے مجھے جو ناقابل بیان مسرت حاصل ھوئی تھی اس کا میرے رویے سے اظہار نہ ھونے پائے لیکن جلد ھی پتہ چل گیا کہ ویل‌مراد آغا کو اپنے اس خزانے کی سچی قیمت اچھی طرح معلوم ھے اور اس سے اس بات کو کسی طرح چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس نے یہ بات یوں ھی تھوڑی

عورت گھر گرھستی کے کاموں میں مصروف تھی، کبھی اندر جاتی کبھی باھر آتی۔ اس نے شوھر کی بات خاموشی سے سنی اور چپ چاپ جاکے خیمے کے اندر لٹکتے ھوئے موٹے اونی تھیلے میں ھاتھ ڈال کے ریشمی کپڑے کی ایک پوٹلی نکالی۔ پھر اس نے اس پوٹلی سے بڑی احتیاط کے ساتھ کتاب باھر نکالی اور اسے لاکر کچھ اتنے اھتمام سے مکان‌مالک کے سپرد کیا جیسے وہ کوئی مقدس چیز ھو۔ بوڑھے نے ایک بار پھر مجھ کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور کہا:

"اگر تم نے اپنا پیشہ صحیح بتایا ھے تو تم کو اس کا فوراً ھی اندازہ ھو جائےگا کہ اس چیز کی قیمت کیا ھے۔ اور تم اس کی جو قیمت بتاؤگے اس سے مجھے پتہ چل جائےگا کہ تم کون ھو۔ یہ رھی کتاب، جوں کی توں، ساری کی ساری۔ لو، دیکھو" یہ کہہ‌کر اس نے کتاب مجھے دے دی اور پھر صاف جھلکتی ھوئی بیتابی سے پوچھا۔ "اب بتاؤ اس قسم کی کوئی دوسری چیز بھی تم نے کہیں دیکھی ھے؟ یہ ایسی ھے کہ... دیکھا، یہ کیسی ھے؟ اس کے ایک ایک لفظ کی قیمت ھے ایک اونٹنی مع بچہ۔"

یہ ایک موٹی سی، بھاری سی کتاب تھی جس کی عام سوتی کپڑے کی جلد پر سرخ رنگ کے بڑے بڑے پھولوں کے کچھ نشانات باقی تھے۔ کتاب عربی رسم‌الخط میں لکھی تھی اور ھر صفحے پر چیری کے رنگ کی اور لال رنگ کی تقریباً بیس بیس سطریں تھیں۔ اس کی کتابت بہت صاف تھی جس سے اندازہ ھوتا تھا

بیچ دو؟ وہ تو اپنی اس دولت کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملائے جا رہا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس کی بیوی کو بھی یہ کتاب اتنی ہی عزیز ہے۔ مالک اور مالکن ہی کیا، گاؤں کے دوسرے لوگ بھی غالباً یہ کسی طرح گوارہ نہ کریں گے کہ یہ نادرالوجود چیز ان کے گاؤں سے باہر چلی جائے۔ بوڑھا مجھ کو بالکل مایوس کئے دے رہا تھا۔ میں اس کی باتیں سنتا جاتا تھا اور اپنے حافظے میں محفوظ ان تمام کتابوں کو ایک ایک کرکے دیکھ رہا تھا جن کو میں نے دوسرے مقامات سے حاصل کیا تھا۔ ان میں سے زیادہ‌تر کتابیں اپنے مالکوں کے لئے بہت ہی عزیز ضرور تھیں لیکن کسی کتاب سے اتنا پیار، اتنی والہانہ محبت میں نے کہیں اور نہیں دیکھی تھی۔ ایسے کسی آدمی کو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ویل‌مراد آغا کوئی بات سنتا ہی نہیں تھا، بس اپنی کتاب کی تعریفیں کئے جا رہا تھا۔ تب میں نے پینترا بدلا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مجھے اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے پوچھا کہ مویشی فارم میں کام کیسا چل رہا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ گاؤں‌والے سب کے سب آمودریا کے اس پار جاکر بسنے اور وہاں جم‌کر کھیتی‌باڑی کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ بوڑھے نے میرے ان سوالوں کے جواب دے دئے اور پھر دوبارہ کتاب کی بات چھیڑ دی۔ کہنے لگا کہ سب اس کو لےکر پڑھتے ہیں، رشتے‌دار بھی اور دوست احباب بھی، اور سب اس کی تعریفیں کرتے

کہی تھی کہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کی قیمت ایک اونٹنی اور اس کے بچے کے برابر ھے اور اس پائے کی کوئی دوسری کتاب ڈھونڈے سے نہیں ملنے کی۔ بوڑھے کا امتحان لینے کے لئے میں ادھر ادھر سے کچھ اشعار سناکر پڑھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے دس مصرعے پڑھے تو ویل‌مراد آغا نے آگے کے سو مصرعے حافظے سے سنا دئے، میں نے کسی نظم یا غزل کا صرف مطلع پڑھا اور اس نے تمام حصہ سنا دیا۔ پھر اس نے کہا:

"اب تمہیں یقین آ گیا نا نوجوان، کہ کسی سونے کے صندوق میں رکھنے کے لائق ھے؟"

جوش میں آکر اس نے ایک نظم جو شاید اس مجموعے میں اس کی سب سے پسندیدہ نظم تھی، ترنم سے سنا دی پھر کچھ ھیجانی کیفیت میں کہا:

"دیکھا تم نے؟ اسے جتنا زیادہ پڑھا جائے اتنا ھی زیادہ متاثر کرتی جاتی ھے۔ اب تمہی کہو، ایک ایک لفظ کی ایک اونٹنی جتنی قیمت ھے کہ نہیں؟"

ھاں، بات ایسی ھی تھی اور میرے لئے اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میں تو بس یہی سوچ رھا تھا کہ اس کتاب کو جسے میں ھاتھ میں پکڑے ہوئے ھوں کس طرح حاصل کروں۔ اسے بہرصورت حاصل کرنا ھے۔ ایک لفظ ایک اونٹنی کے حساب سے پوری کتاب کی کتنی اونٹیاں بنتی ھیں؟ اتنی قیمت میں کہاں سے ادا کروں؟ اور پھر یہ بات بھی ھے کہ بوڑھے سے کس منھ سے کہوں کہ اپنی یہ کتاب میرے ھاتھ

بار دیکھ لےگا، آسانی سے چھوڑکر نہ جائےگا۔ تم نہ پہلے شخص ہو نہ ھی آخری۔"

بوڑھے نے اس تھیلے کی طرف ھاتھ بڑھایا، اس میں سے ریشمی پوٹلی اٹھائی اور اسے کھول کے کتاب باھر نکالی۔

"پڑھنا چاھتے ھو تو لو پڑھو۔ اب تو تمہیں یقین ھو گیا ھوگا کہ اس کے ایک ایک لفظ کی قیمت..."

"جی ھاں، آپ ٹھیک کہتے ھیں! بالکل ٹھیک" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور جیسے ناخوشی سے کتاب کے ورق الٹنے پلٹنے لگا۔ ضروری تھا کہ میں بوڑھے سے اپنے ارادے کا اشاروں میں تذکرہ کر دوں۔ چنانچہ میں نے ھچکچاتے ھوئے بات شروع کی:

"ویل مراد آغا!"

"ھاں، کہو۔"

"یہ نسخہ آپ کے پاس کتنے دنوں سے ھے؟"

"چالیس سال ھو چکے ھیں۔"

"چالیس سال؟"

"ھاں، بیٹے۔"

"یہ بات ھے۔ تبھی تو اس کے کچھ اشعار آپ کو زبانی یاد ھیں۔ اب سمجھ میں آیا۔"

"کچھ نہیں بیٹے، لفظ لفظ یاد ھے" بوڑھے نے وضاحت کی۔ "اس میں جتنے بھی گیت ھیں وہ سب میں دیکھے بغیر شروع سے آخر تک ترتیب سے سنا سکتا ھوں۔ وہ سب میرے دماغ پر نقش ھیں۔"

ھیں۔ اس نے کہا کہ اسے اس کے مالک ھونے پر بڑا ناز ھے اور اس خزانے کو کبھی بھی اپنے ھاتھ سے جانے نہ دے گا۔

بالآخر میں اٹھا اور بوڑھے سے رخصت ھوکر چلا آیا۔

اپنی جائےقیام پر لوٹ‌کر میں نے اپنے میزبان یعنی اجتماعی فارم کے چیرمین کو بتایا کہ مجھے کتاب کو حاصل کرنے میں ناکامی ھوئی ھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آدمی کے دل میں کیسے راہ پائی جائے" میں نے اپنے میزبان سے کہا۔ "اس آدمی پر میرا کوئی بس نہیں چلتا۔ بیچنے کی بات تو دور ھی رھی، مجھے خدشہ ھے وہ مجھے اس کتاب کو نقل کرنے تک کی اجازت نہ دے گا۔"

میرا میزبان کوئی ایسی بات نہ بتا سکا جس سے مجھے کوئی امید بندھتی۔

"ھم میں سے کسی کو یہ ھمت نہ ھوگی کہ ان سے کہے کہ اپنی کتاب بیچ دو" میرے میزبان نے کہا۔ "اگر آپ کو اس کی اتنی ضرورت ھے تو آپ خود ھی ویل‌مراد آغا کے دل میں راہ پانے کی ترکیب سوچئے۔ میں نے آپ سے پہلے ھی کہا تھا کہ کام بہت مشکل ھے۔"

میں ھمت ھارنےوالا نہیں تھا۔ چنانچہ اسی روز شام کو پھر ویل‌مراد آغا کے ھاں پہنچ گیا۔ اس بار بھی وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملا۔

"آؤ، آؤ، بھلے نوجوان۔ آؤ بیٹھو۔ انگیٹھی کے قریب بیٹھو نا۔ میں تو جانتا ھوں کہ جو کوئی بھی اسے ایک

یہی بہت تھا کہ اس نے مجھے اسی دم نکال باہر نہیں کیا۔ اس نے ایسا کیا ہوتا تو میرے لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہ ہوتی۔

وہ دیر تک دم سادھے بیٹھا رہا اور پھر دبی دبی سی آواز میں کہنے لگا:

"اے بھلے نوجوان! کیا ہم میاں بیوی دونوں نے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ہم اس کتاب کو کبھی بھی اپنے سے الگ نہیں کریں گے؟ کچھ لوگ تو بکواس کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بکتی نہ ہو لیکن میرا خیال بالکل دوسرا ہے۔ تم میرے مہمان ہو۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے میں تم سے ایک بار پھر صاف صاف کہتا ہوں کہ تم اس کتاب کو نہ مانگو۔ ہمارے بیچ صلح و آشتی بنی رہے گی۔ یہ کتاب تمہاری ہو جائے، اس کے لئے میری منظوری ضروری ہے۔ ہے کہ نہیں؟"

"جی ہاں، بالکل۔ اور کیا!" میں نے جواب دیا۔

"اور میں منظوری نہ دوں گا۔"

مجھ پر جیسے مردنی سی چھا گئی لیکن اس کی پروا کئے بغیر بوڑھا کہتا گیا:

"اگر میں راضی بھی ہو جاؤں تو میرا بیٹا اور میری بیوی دونوں تیار نہ ہوں گے۔ اگر وہ بھی دینے کو تیار ہو جائیں تو گاؤں والے نہ لے جانے دیں گے۔ کسی طرح بھی اس کی اجازت نہ دیں گے۔ اسے دینے کی بات ہی نہیں ہو سکتی۔ ہم اسے خود سے کبھی جدا نہ کریں گے۔ ایسے دن بھی آئے ہیں کہ ہمیں فاقے کرنے

"بہت اچھا!" میں نے جوش سے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب آپ کو اس نسخے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔"

ویل‌مراد آغا چونک اٹھا اور تیز نگاہوں سے مجھ کو دیکھنے لگا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا اور ساتھ ہی ساتھ گلہ بھی تھا جیسے کہہ رہی ہوں، اچھا یہ تھا تمہارا مقصد؟ تم میرے گھر اسی لئے آئے ہو! تو پھر صاف کہہ دو نا!

میں شرمندہ ہوا اور ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا:

"آپ جو دام چاہیں دینے کو تیار ہوں۔ آپ اس کو مجھے دے دیجئے! اسے میرے ہاتھ فروخت کر دیجئے۔"

بوڑھے کی صورت ایک‌دم بدل گئی۔ اس کی آنکھیں ایک عجیب انداز سے چوڑی ہو گئیں۔ داڑھی پھیل گئی۔ اس کی بیوی چونک اٹھی اور بیٹھ سی گئی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان پکڑے پتھر بنی کھڑی رہ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے منھ سے نکلی ہوئی بات سے خیمہ‌نما گھر کانپ اٹھا، دیوار سے لٹکی ہوئی مشکیں لرز اٹھیں اور چھت سے لٹکتی ہوئی رسیاں تک ہچکولے کھانے لگیں۔ میں گھبرایا اور سانس روکے بیٹھا تھا۔ آخر بوڑھے کے ہوش و حواس درست ہوئے۔ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین‌کر اسے اپنی بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے سختی سے کہا:

"لو اسے اس کی جگہ پر رکھ آؤ!"

۲

"لو سنو، نوجوان" کہہ کر اس نے کہانی شروع کی۔ "میں پینسٹھ سال کا ہو چکا ہوں۔ اگر تم سب کچھ جاننا چاہتے ہو تو لو سنو، میں تمہیں اس سے چالیس سال پہلے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس کتاب کو میرے ہاتھ آئے اب کے موسم خزاں میں ٹھیک چالیس سال ہوئے ہیں۔ جس سال یہ کتاب میں نے حاصل کی وہ شدید سردی کا سال تھا۔ اور میں ہمیشہ کی طرح ایک گلہ‌بان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب میں اتنا موٹا ہو گیا ہوں کہ اپنے پوستین میں نہیں سماتا۔ میں بچپن ہی سے ریگستان میں رہتا اور بھیڑوں کے گلے چراتا آیا ہوں۔ اور ظاہر ہے مجھے اس کا علم ہی نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے۔ ہاں میں نے سنا ضرور تھا کہ دنیا میں کتاب نام کی کوئی چیز ہوتی ہے لیکن آنکھوں سے دیکھنے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔

وہ واقعہ یوں ہوا تھا۔ میں نے گھر بسایا، ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔ پھر رقم جمع کرکے ایک اونٹنی خریدی جو اچھی نسل کی بھی تھی اور گابھن بھی۔ اب جو آدمیوں میں میرا شمار ہونے لگا تو میں نے جاڑوں کے لئے کچھ اناج فراہم کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں آرکچ جانے کی ٹھانی۔ اپنی اونٹنی پر ایک طرف اون اور دوسری طرف سکساؤل کا کوئلہ لادا اور چل پڑا۔ آرکچ پہنچ کر اپنے اس سامان کو میں نے ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہاں میری جان پہچان کا

پڑے، ہم سوکھی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ترستے رہے۔ لیکن تب بھی ہمیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ کتاب کو فروخت کر دیں۔ آج کی تو بات ہی کیا! ارے چھوڑو ان باتوں کو۔ فضول ہیں یہ باتیں سب۔ جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس چیز کی قیمت کیا ہے۔ کاش تم جانتے کہ یہ ہمیں کس طرح ملی ہے! تب تم اس کو ہم سے کبھی نہ مانگتے۔"

ویل‌مراد آغا دو تین منٹ تک چپ رہا اور پھر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو، بات جاری رکھی:

"اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ ہم نے اس کو کس طرح حاصل کیا ہے۔ یوں تو میں اس واقعے کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کہاوت بن جاؤں۔ ویسے ہی لوگ بات بات پر کہتے ہیں: "جیسے ویل‌مراد نے کتاب خریدی ہے"، "کتاب‌والے ویل‌مراد کی طرح!"

"ہاں سنائیے ویل‌مراد آغا۔ ضرور سنائیے۔ ابھی، اسی دم سنائیے!" میں اپنی بیقراری کو نہ چھپا کر اصرار کرنے لگا۔ "میں اس کتاب کی ساری کہانی جاننے کے لئے بیتاب ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں سناتا ہوں" بوڑھے نے جواب دیا۔ اس نے زمین پر بچھے ہوئے نمدے پر ہاتھ مارا، اپنا سر اونچا کیا اور سینہ تان لیا۔ اس طرح وہ بہت دن پہلے کی باتیں یاد کرنے اور کہانی کے تانے بانے ٹھیک کرنے لگا۔

اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔ جو پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا چلا گیا۔ ورق الٹتا گیا۔ میں حیران تھا کہ اس کی زبان اس کا ساتھ کیسے دے رہی ہے، تھکتی کیوں نہیں ہے۔ میں سنتا گیا۔ سنتا چلا گیا... اس کتاب نے میرا دل موہ لیا۔ میں ہوش و حواس گنوائے بیٹھا سنے جا رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ایک شخص میرے سامنے بیٹھا کاغذ کو دیکھ دیکھکر بڑی عمدہ باتیں سنا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اپنی آپ‌بیتی سنا رہا ہو۔ اور زیادہ غور سے سنا تو ایسا لگا کہ کوئی خود میری آپ بیتی سنا رہا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اکثر میرے دماغ میں بھی آتی تھیں۔ دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی بڑی صاف صاف باتیں تھیں۔ اس سے پہلے مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کتاب نام کی چیز میں اتنی کشش ہوگی، وہ زندگی کے بارے میں اتنے پتے کی باتیں سناتی ہوگی کہ ان کو سن‌کر آدمی اپنے آپ ہی سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ جس طرح اس نے آج تم کو متاثر کر دیا اسی طرح اس وقت میرا دل بھی موہ لیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے اس کتاب کی قیمت ادا کی جا سکے۔ شاید ایسی چیزیں بیچی ہی نہ جاتی ہوں‌گی۔ اس کتاب کے لئے میرا جی اتنا للچایا کہ میں نے عہد کیا کہ اگر اس کتاب کی کوئی قیمت ہے اور اس کی ادائیگی میرے بس کی بات ہے تو

کوئی آدمی نہیں تھا سو میں رات بتانے کے لئے اس آدمی کے گھر ٹھہر گیا جس نے میرا اون اور کوئلہ خریدا تھا۔ وہ ایک امیر آدمی تھا۔ جب رات ہونے لگی تو اس کے گھر میں لوگ جمع ہونے لگے۔ اس قصبے کے بوڑھے، جوان بہت سے مرد جمع ہوئے۔ ان کے بیچ ایک آدمی نے فوراً ہی میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ وہ بہت عمدہ کپڑے پہنے تھا۔ بیلچے جیسی ڈاڑھی تھی اور منھ سرخ اور پھولا پھولا سا تھا۔

لوگ اس سے درخواست کرنے لگے:

"مولوی صاحب! ذرا ہمیں کتاب پڑھ کر سنائیے۔ بڑی عنایت ہوگی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے یہی کتاب اس آدمی کی طرف بڑھائی۔ لیکن وہ راضی نہ ہوا، کہنے لگا:

"ارے نادانو! اس کتاب کو ایک پاگل شاعر نے لکھا ہے۔ اس نے نہ جانے کہاں سے باغیانہ باتیں سیکھ لی ہیں اور اپنی کتاب کے ذریعے نفرت اور بدچلنی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی کتاب کو تو سال میں صرف ایک بار ہی پڑھا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں ورنہ یہ پڑھنے اور سننے والوں کو بگاڑ دے گی۔ اس کو رہنے دو۔ لو میں تمہیں ایک دوسری کتاب پڑھ کر سناتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اپنے چغے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے ایک کتاب نکالی۔ لیکن لوگ اس سے بھی زیادہ ضدی نکلے۔ کسی نے مولوی کو انعام دینے کا وعدہ کیا اور وہ نرم پڑ گیا۔ اس نے اس کتاب کو ہاتھ میں لیا اور

لیکن میں نے یقین کر لیا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا: "واہ کتنی اچھی بات ہے! ایسی عمدہ چیز کی قیمت بس ایک اونٹ!" میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسی دم اپنی اونٹنی دےکر اس کتاب کو حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا اور مالک مکان سے کہا:

"اگر اس کتاب کی یہی قیمت ہے تو میری اونٹنی کو لے لیجئے اور وہ کتاب مجھے دے دیجئے۔ اونٹنی بڑی عمدہ ہے اور بچہ دینے کو بھی ہے۔"

وہ سب لوگ اسی طرح میری ہنسی اڑاتے ہوئے کہنے لگے:

"ٹھیک ہے، اپنی اونٹنی یہیں چھوڑ دو اور کتاب لے جاؤ۔"

میں نے آخری بار اپنی اونٹنی کی طرف دیکھا، کتاب کو لےکر اپنے چغے کے اندر چھپایا اور گھر چل دیا۔ تین دن تک برابر چلتا رہا اور تھکا ہارا آخر گھر پہنچ گیا۔ میری بڑھیا گھر پر تھی (ویل‌مراد آغا نے حسب عادت اپنی بیوی کو بڑھیا کہہ دیا، لیکن ان دنوں تو اس کی عمر شاید بیس سال سے بھی کم رہی ہوگی)۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف دوڑی اور چیختی ہوئی پوچھنے لگی:

"ہائے! ہماری اونٹنی کیا ہو گئی؟ اس کا کیا کیا تم نے؟ کہیں کھو آئے کیا؟ چوروں ڈاکوؤں نے اسے تم سے چھین لیا کیا؟ ہائے اللہ! یہ کیا مصیبت آن پڑی!"

وہ پاگلوں کی طرح چلائے جا رہی ہے، اپنے گریبان

میں اس کو ضرور خرید لوں گا۔ لیکن مجھے یہ امید بہت کم تھی کہ مجھ ایسے ایک ادنی سے چرواھے کو یہ خزانہ میسر ہو جائے گا۔ انہی خیالوں میں کھویا ہوا میں رات بھر جاگتا رہا۔ پڑے پڑے سوچتا رہا کہ ایسی چیزیں شاید ھی بکتی ھوں۔ آخر اس کے لئے ایسے عمدہ عمدہ الفاظ کس نے تراشے ھوں گے؟ کس انسان نے الفاظ کو اس خوبی سے ایک دوسرے سے جوڑا ہوگا؟ واقعی کیا یہ کسی انسان کے بس کی بات بھی ھے؟

صبح ھوئی تو مالک مکان کو دیکھتے ھی میں اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا:

"مولوی صاحب نے جو کتاب پڑھ کر سنائی تھی اس کی کیا قیمت ھوگی؟"

"اس کی کوئی جچی تلی قیمت نہیں ھے" اس نے مسکراتے ھوئے جواب دیا۔ "کتاب عورتوں کا کوئی رومال یا کوئلے کی بوری تھوڑی ھے کہ آسانی سے اس کی قیمت بتائی جا سکے۔"

"آپ ذرا سوچ کے دیکھئے۔ بتائیے نا، اس کی قیمت بتائیے" میں نے گزارش کی۔

مالک مکان اور دوسرے لوگوں نے جو وھاں موجود تھے، ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر انہوں نے میری ھنسی اڑائی۔ پھر مالک مکان نے کہا:

"اس کی قیمت ھے ایک اونٹ۔ ایک عمدہ اونٹ۔ اس سے کم نہیں۔"

ہو سکتا ھے، اس نے یہ بات مذاق میں کہہ دی ہو

"ارے تم پریشان نہ ہو۔ سودا ہم نے بہت اچھا کیا ہے۔"

اس کو تسلی دینے کے لئے میں نے اس رات کا سارا واقعہ اسے سنا دیا: کس طرح مولوی نے وہ کتاب پڑھ‌کے سنائی تھی، کس طرح لوگ غور سے اسے سن رہے تھے اور کس طرح میں خود غور سے اسے سن رہا تھا اور مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ کتاب کے جو تھوڑے بہت اشعار میرے دل اور دماغ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئے تھے ان کو بھی سنا دیا۔

"جو کچھ میں تمہیں سنا رہا ہوں وہ سب کتاب کے اندر موجود ہے" میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "افسوس ہے کہ مجھے سنانا نہیں آتا، ایک بھی لفظ ٹھیک سے نہیں بتا سکا ہوں، تم فکر نہ کرو بیوی!"

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ اونٹنی کو کسی طرح بھول ہی نہیں پا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔

"ارے اس کے ایک ایک لفظ کی قیمت ایک اونٹنی کے برابر ہے" میں اس کو پھر ایک بار تسلی دیتا ہوں لیکن میری بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ چلے اور اس نے روتے ہوئے کہا:

"تم سچی بات کیوں نہیں کہہ دیتے؟ یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ اونٹنی کو تم کسی کو یوں ہی دے آئے ہو۔ ہمارے خاندان کی ساری امیدوں پر پانی پھر

کو پکڑکر پھاڑ ڈالنے کا ارادہ کر رهی هے جیسے کوئی بڑی مصیبت نازل هو گئی هو۔

میں اس کو تسلی دینے لگا:

"ارے ٹھہرو۔ چیخو چلاؤ مت۔ یه آه و زاری کیوں کر رهی هو؟ تمہیں تو خوش هونا چاهئے۔ هماری عمده اونٹنی نے بہت هی عمده بچه دیا هے۔ میں اس کے عوض میں ایک چیز لایا هوں" میں نے کتاب اپنے بغل سے نکال کر دکھائی اور کہا:

"یه رهی۔ کپڑے کی اس جلد کے اندر ایک ایک لفظ عمده قسم کی ایک اونٹنی کے برابر قیمتی هے۔ ٹھہرو، تمہیں سب کچھ معلوم هو جائے گا۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

بیوی نے کتاب کی طرف دیکھا۔ اس کو هاتھ میں لیا اور کھول کر اس کے اوراق دیکھے۔ پھر کوئی مقدس چیز سمجھ کر اسے اپنے ماتھے سے لگایا، منھ سے لگایا اور چوما۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور گم سم کھڑی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رها تھا که خوش هو یا روئے۔ میں محسوس کر رها تھا که اپنی اونٹنی کے خیال کو وه کسی طرح اپنے دماغ سے نکال هی نہیں پا رهی هے۔ دراصل اسی اونٹنی پر هماری گزر بسر کا انحصار تھا، اسی سے تو هماری امیدیں وابسته تھیں۔

میری بیوی سوچ میں ڈوبی پریشان کھڑی هے اور میں اس کے دل کا بوجھ ذرا هلکا کرنے کے لئے کہه رها هوں:

2*

خریدی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ میں ایک آدمی سے جو گاؤں بھر میں سب سے زیادہ دانشمند سمجھا جاتا تھا، جاکر بات کروں۔ میں اس آدمی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ میرے پاس ایک کتاب ہے، آپ ذرا کسی ایسے آدمی کا پتہ بتائیے جو اس کتاب کو پڑھ کر سنا سکے۔ وہ آدمی بڑا حیران ہوا اور پوچھا:

"آخر یہ تمہارے ہاتھ کیسے آ گئی؟"

"سستی مل گئی اور میں نے خرید لیا اس کو" میں نے جواب دیا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا، اپنے شانے اچکائے اور پھر ہمدردانہ لہجے میں کہا:

"ارے ناسمجھ لڑکے! معلوم ہوتا ہے تمہارا سر پھر گیا ہے۔ تم نے اس کتاب کو خریدا ہی کیوں؟ یہ مفت ہی مل جاتی تب بھی اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچتا؟ خود ہی ذرا سوچو نا۔ کتاب کو پڑھنے کے لئے کسی تعلیم‌یافتہ آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایسا آدمی تمہیں کہاں ملے گا؟ سارے گاؤں میں ایسا ایک بھی شخص ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ آس پاس کے مواضعات میں بھی نہ ملے گا۔ پھر تمہاری اس کتاب کو آخر پڑھے گا کون؟ تم نے یہ بات سوچی کہ نہیں؟"

وہ آدمی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں بھلا کیا اعتراض کرتا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے میری جان عذاب میں پڑتی گئی۔ میری بڑھیا دن رات برابر بک بک کرتی رہتی تھی۔ میرے لئے جینا ہی دوبھر ہو گیا۔ میں نے کچھ اور لوگوں سے بھی مشورہ کیا، آس پاس کے مواضعات

گیا۔ تم دھوکا کھا گئے ہو، ڈھیر سارا کاغذ ھی اٹھا لائے ہو۔ اور کیا!"

وہ زار و قطار رو رھی ھے اور میری سمجھ میں نہیں آ رھا ھے کہ کیا کروں۔ پھر بھی میں نے ھمت نہ هاری۔ بدستور اس کو تسلی دینے کی کوشش کرتا رھا اور کتاب کے ورق الٹتے ہوئے کہا:

"کاش تمہاری نسوانی عقل تمہارا ساتھ دیتی اور تم سمجھ جاتیں کہ اس کے اندر کیا ھے! کاش اس وقت وہ بیلچے جیسی داڑھیوالا مولوی ھی آ جاتا! تو تم اپنی اس عمدہ اونٹنی کو بھول جاتیں۔"

یہ کیا مصیبت ھے کہ کتاب تو انوکھی باتوں سے، شاندار گیتوں سے بھری ہوئی ھے لیکن اس سے میرا کوئی کام نہیں بن رھا ھے۔ وہ چپ سادھے ہوئے ھے، کوئی آواز نہیں نکالتی جیسے ھم میاں بیوی کا منھ چڑھا رھی ہو۔ اب مجھے بھی کتاب پر غصہ آنے لگا۔ میرا جی چاھنے لگا کہ اس کو زمین پر پٹک دوں تاکہ دل کا بوجھ ذرا ھلکا ہو جائے۔ لیکن وہ ھے کہ میری ھتھیلی پر چپ چاپ پڑی ہوئی ھے، بالکل بےگناہ، معصوم۔ اس کے دل کی باتیں سننے کے لئے تو کسی پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت ھے۔ اور ھمارے ریگستان میں ایسا آدمی کہاں ملےگا... میں حیران و پریشان خیمے کے اندر چلا جاتا ہوں۔ لمبا راستہ طے کرکے تھکا ھارا آیا ہوں، لیکن بیٹھکر ایک پیالی چائے پینے کو بھی جی نہیں چاھتا۔ میں پھر باھر آ جاتا ہوں۔ اب مجھے افسوس ہو رھا ھے کہ میں نے بیکار ھی یہ کتاب

2—3078

مجھ سے کہنے بھی لگی کہ کاش تمھاری کتاب کو پڑھانے کی کوئی صورت نکل آئے۔

"صرف مولوی اور ایشان ہی پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ وہ کتابیں پڑھ لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوسروں کو بھی پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم اپنے بیٹے مرادجان کو کسی مولوی یا ایشان کے ہاں پڑھنے کے لئے بھیج دیں؟ اس کے پاس وہ پڑھنا سیکھ لےگا اور پھر اس کتاب کو پڑھکر ہمیں سنا سکےگا۔ آقچی ایشان ہی کو لو۔ کہتے ہیں کہ علم اور فضیلت میں وہ ایشانوں میں سب سے آگے ہے۔ آؤ مرادجان کو اسی کے پاس بھیج دیں۔ گھر بار کا کام ہم خود کسی طرح چلا لیں گے۔ پانچ چھ سال میں لڑکا پڑھنا لکھنا سیکھکر لوٹ آئےگا۔"

بیوی کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی۔ میں خود اس کتاب کو پڑھنے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ ہم نے ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں ہمارے بیٹے کی عمر یہی کوئی سات آٹھ برس کی تھی۔ میں اس کو ساتھ لےکر آقچی ایشان کے گھر پہنچا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا:

"میں بہت دور سے آپ کی خدمت میں ایک گزارش لےکر آیا ہوں۔ کیا آپ میرے بچے کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں گے؟ جب تک یہ آپ کے ہاں رہے جیسا کہ قاعدہ ہے اس کا گوشت و پوست آپ کا ہے اور ہڈیاں میری۔ ضرورت ہو تو آپ اس کو ماریں پیٹیں، کام کاج کرانا

میں گیا لیکن کوئی پڑھا لکھا آدمی نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ دنیا میرے خلاف سازش کئے بیٹھی ھے۔ لوگ اکثر مجھ سے کہتے: "تم تو ایک گلہ‌بان ٹھہرے، سب سے غریب، سب سے مفلس آدمی۔ کتاب خریدنے کی بات تمہیں کیسے سوجھی؟ اس کو بھی کوئی کھیل سمجھ بیٹھے تھے تم کیا؟ یہ تمہارے کس کام کی ھے؟ آخر میری ھمت جواب دینے لگی۔ ایک دن باھر سے لوٹا تو اس خزانے کو اٹھاکر تھیلے میں سب سے نیچے رکھ دیا اور اوپر ادھر ادھر کی ردی چیزیں ڈال دیں۔ سوچا: میری نظروں سے دور ھی رھے اور میرے دل میں ندامت کی آگ ذرا ٹھنڈی ھو جائے۔ کتاب یونہی تھیلے میں پڑی رھی۔ ایک سال گزرا، دو سال گزرے، یہاں تک کہ ایک ایک کرکے سات سال گزر گئے۔ لیکن میری بیوی کا رونا دھونا بند نہ ھوا۔ وہ دن رات بڑبڑاتی رھتی تھی: "ھائے! کیسی اونٹنی تھی، کتنی عمدہ! ھائے، کیسی اونٹنی تھی بچہ دینےوالی! اب تک تو اس نے تین بچے دئے ھوتے، ھم اچھے خاصے مالدار بن جاتے۔ ھمارے دل میں سکون آ جاتا!"

وہ جب دیکھو تب یہی رونا روتی رھتی تھی۔ دراصل ایک بار بھی تو کسی نے اس کتاب کو پڑھ‌کر نہیں سنایا تھا۔ میں کتاب کی چاھے جتنی تعریف کرتا اس کا بڑھیا پر کوئی اثر ھوتا نظر نہ آتا تھا۔ ھاں وہ یہ آرزو ضرور دل میں چھپائے ھوئے تھی کہ کاش یہ معلوم کر لے کہ اس کتاب کے اندر ھے کیا۔ بعد میں وہ

وہ کرو۔ پڑھنے لکھنے کی بات تو دور رہی، مجھے تو یہ حیرت ہوئی کہ اس جی توڑ محنت سے لڑکا پاگل کیسے نہ ہو گیا، اس کی اپنی فطرتی عقل کیسے باقی رہ گئی۔

مجھ کو دیکھتے ہی وہ آکر مجھ سے لپٹ گیا اور رو روکر کہا:

"میرے پیارے ابا! مجھ کو یہاں سے جلدی لے چلئے۔ ایشان نے کام کراتے کراتے میرا برا حال کر دیا ہے۔ ٹھیک طرح سے کھانے کو بھی نہیں دیتا۔ بھوکوں مارتا ہے۔ اور پڑھاتا لکھاتا کچھ بھی نہیں۔ وہ تو خود جاہل ہے، پڑھنا لکھنا جانتا ہی نہیں ہے۔"

میں اپنے ہاتھ سے لڑکے کا منھ بند کرتا ہوں۔ کہتا ہوں کہ تم ایسی باتیں منھ سے مت نکالو۔ کسی ایشان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جاہل ہے، بڑی گناہ کی بات ہے۔ ذرا شرم کرو، بیٹے! تم ابھی بچے ہو۔ تمہاری عقل بھی بچوں جیسی ہے۔ لیکن وہ رو روکر کہے جا رہا ہے:

"آقچی ایشان کو تعویذ تک لکھنا نہیں آتا، بالکل ان‌پڑھ ہے ان‌پڑھ۔ جب کوئی تعویذ لینے آتا ہے تو یہ تعویذ کی جگہ نمک دے دیتا ہے۔ بس ویسا ہی نمک جیسا میری ماں کی تھیلی میں رہتا ہے۔ میں یہاں پڑھنا کبھی بھی نہ سیکھ سکوں‌گا۔"

میں نے ایک بار پھر لڑکے کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا:

"تم ابھی کم‌سن ہو، ناسمجھ ہو۔ تم اس آن بان‌والے

ہو تو کرائیں، بس اس کو کسی طرح لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔"

ایشان نے مجھے امید دلاتے ہوئے کہا:

"تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنے بیٹے کو میرے پاس لے آئے۔ جس نے بھی میرا نمک کھایا ہے، میری نگرانی میں تربیت پائی ہے، آدمی بن ہی گیا ہے۔ اگر تمہارے بیٹے نے میرے ہاں تربیت پائی تو بےشک کچھ بن جائے گا۔ دیکھ لینا۔ چار سال کے بعد آنا۔ اس کو تو تم پہچان بھی نہ پاؤگے۔"

میں نے ایشان کی باتوں پر یقین کر لیا اور خوش خوش واپس گھر کو چلا۔ گھر آکر میں نے بیوی سے کہا: "بیوی، سب ٹھیک ہو گیا۔ اب چار سال تک صبر کرو۔ پھر دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے۔ اب وہ دن دور نہیں ہے جب تم خود ہی فیصلہ کر سکوگی کہ میرا سودا صحیح تھا کہ غلط۔"

ہاں بات ایسی ہوئی۔ اس کے بعد تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔ کتاب جوں کی توں تھیلے کی تہ میں پڑی رہی۔ وقت بہت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مرادجان شاید کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ گیا ہوگا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور مدت پوری ہونے کا انتظار کئے بغیر میں ایشان کے گھر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنے بیٹے کا حال جو دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ سارا سارا دن کام میں جٹا رہتا ہے۔ مالک اور اس کی بیوی دونوں اس کو ہدایات دیتے رہتے ہیں کہ یہ کرو،

تھا۔ اس کی طاقت کا منبع تھے اس کے خاندانی رشتے۔ اس کے آبا و اجداد کے نام زبان پر آتے ھی سارا گاؤں کانپنے لگتا تھا۔ ان کے متعلق کوئی بری بات منھ سے نکالنے کی کسی کو جرات نہیں ھوتی تھی کیونکہ وہ لوگ کسی بڑے راز کے مالک تھے۔

"ایک دفعہ ایک معجزہ ھوا" آقچی ایشان کا پڑوسی بتانے لگا۔ "آقچی ایشان کا دادا بھی ایشان گزرا ھے۔ ایک دن ایک آدمی اس کے ھاں سے سوکھی گھاس کا ایک بوجھ چپکے سے اٹھاکر لے گیا۔ وہ اپنے گھر آیا اور بوجھ کو زمین پر رکھنا چاھا تو وہ کسی طرح اس کی پیٹھ سے الگ ھی نہ ھوا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بلایا۔ اس نے بھی زور لگایا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہ آدمی بہت پریشان ھوا، اپنے کئے پر بہت پچھتایا، اپنے آپ کو خوب برا بھلا کہا اور گھاس کے بوجھ کو وھاں لے گیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ اس نے بوجھ کو اپنی جگہ پر رکھ دینا چاھا لیکن پھر وھی بات۔ وہ ساری رات اس گھاس کو پیٹھ پر لادے لادے پھرتا رھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ گھاس کے مالک کے پاس جاکر اس سے معافی مانگے۔ وہ ایشان کے پاس گیا اور اس سے کہا: "ایشان آغا! مجھ سے ایک بڑا گناہ ھو گیا ھے۔ میں رات بھر اپنے گناہ کو اپنے اوپر لادے لادے پھرا ھوں۔ افسوس و ندامت سے میرا دل خون ھو چکا ھے۔ میرا گناہ بخش دیجئے، ایشان آغا۔ میرے دل پر سے اس گناہ کا بوجھ اتاریئے۔ دیکھئے میرا جسم ابھی تک آپ کی گھاس کے بوجھ تلے دبا ھوا ھے۔ اس کو اتار دیجئے۔"

آدمی کی خواہ مخواہ برائی کر رہے ہو۔ سارا گاؤں اس کی بات پر ایمان لاتا ہے۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ ایشان بڑا دانشمند عالم اور بڑا دین ایمان‌والا آدمی ہے۔ تم تین سال تک اس کا نمک کھاتے رہے ہو اور اب اس کے بارے میں ایسے کلمات استعمال کر رہے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی!"

لیکن مرادجان پر خاک بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے کچھ اور بھی اونچی آواز سے کہا:

"ابا! اگر آپ نہ لے جائیں گے تو میں خود ہی یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

مجھے بڑا دکھ ہوا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ معلوم کرنا چاہئے کہ مرادجان کی بتائی ہوئی باتیں کہاں تک درست ہیں۔ اس ارادے سے میں ایشان کے ایک پڑوسی سے ملا۔ میں نے اپنی رام کہانی مختصراً اس کو سنا دی اور پھر پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے، ایشان میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دے گا کہ نہیں؟ ایشان کا پڑوسی سیدھا سادہ نیک دل آدمی تھا۔ اسے ایشان کے بارے میں جو کچھ معلوم تھا سب مجھے بتا دیا۔ جہاں تک لکھنے پڑھنے کا تعلق تھا، معلوم ہوا کہ مرادجان ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ایشان کو نہ پڑھنا آتا تھا نہ لکھنا۔ اس نے کہیں تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن بات یہ تھی کہ ایشان ان‌پڑھ ہونے کے باوجود بہت سے تعلیم‌یافتہ مولویوں سے زیادہ طاقتور

یاد آنے لگتی تو میں اسے تھیلے میں سے نکال لیتا اور خواہ مخواہ ہی اس کے ورق الٹنے پلٹنے لگتا۔ میں اس طرح بیٹھ جاتا جس طرح وہ مولوی بیٹھا تھا، کتاب کو بالکل اسی طرح ہاتھ میں پکڑتا، اسی طرح اس کو دیکھتا بھالتا، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ برآمد ہوتا۔ اس سے میری بیوی کی جان البتہ زیادہ عذاب میں پڑ جاتی۔ اس کا پرانا زخم ہرا ہو اٹھتا اور وہ پھر بڑبڑانے لگتی کہ کاش ہم نے اس زمانے میں یہ حماقت نہ کی ہوتی تو آج اچھے خاصے مالدار بن گئے ہوتے۔ آج ہمارے پاس عمدہ اونٹوں کا پورا ایک گلہ ہوتا وغیرہ وغیرہ۔"

۳

"لیکن آخرکار اچھے دن آ ہی گئے" ویل‌مراد آغا نے اپنی کہانی جاری رکھی۔ "خانہ بدوش چرواہوں کی سرزمین میں سوویت اقتدار قائم ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ استاد بھی آئے اور وہ اپنی کتابیں لائے۔ ہمارے گاؤں میں بھی ایک استاد آ گیا۔ اس نے ایک خیمے میں اسکول کھولا اور بچوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ صرف بچوں ہی کو نہیں، ان بڑوں کو بھی جن کو پڑھنے لکھنے کی خواہش تھی۔ میں استاد کو دیکھکر اتنا خوش ہوا، اتنا خوش ہوا کہ کیا بتاؤں۔ سوچا کہ اس استاد کو حکومت نے میرے لئے ہی بھیجا ہے۔ پہلے بہت سے لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے استاد سے کھنچے کھنچے رہے،

ایشان نے چور کو معاف کر دیا اور کہا کہ تم نے جہاں سے اس کو لیا تھا وہیں لے جاؤ۔ وہ آدمی بوجھ کو اس جگہ لے گیا اور وہاں ایشان کی کرامت سے اسے اس بوجھ سے نجات مل گئی۔ وہ آدمی کون تھا، یہ تو کسی کو معلوم نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو سب بوڑھے جانتے ہیں اور اکثر اس کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو رہی آقچی ایشان کے دادا کی بات۔ ویسے آقچی ایشان خود بھی جادوگر ہے جادوگر۔ وہ نمک سے کام لیتا ہے۔ وہ دعا پڑھ‌کر نمک کو پھونک دیتا ہے تو لاولد عورتوں کے ہاں بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور مریض اپنے دکھ درد سے نجات پا جاتے ہیں۔"

"یہ سب سن‌کر میں نے فوراً اپنے دل میں بات طے کر لی" ویل‌مراد آغا نے مزید کہا۔ "مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ میرا بیٹا نمک میں پھونک مارنا سیکھ لے۔ میں مرادجان کو واپس گھر لے آیا اور چرواھوں کے ہاں کام میں لگوا دیا۔

مرادجان بڑا ھوتا گیا۔ وہ بھیڑیں چراتا اور کماتا رہا۔ ان دنوں ہم بہت غریب تھے اور ھمیں اپنے بیٹے کے پڑھے لکھے ھونے سے زیادہ اس کی کمائی کی ضرورت تھی۔

اس طرح ایک ایک کرکے مہینے گزرتے گئے، سال گزرتے گئے۔ میدانوں میں گرد و غبار اٹھتا اور بیٹھتا رہا۔ بہار آتے ھی ھم نئی چراگاھوں میں چلے جاتے اور خزاں آنے پر پھر اس وادی میں لوٹ آتے۔ اور کتاب تھیلے میں یوں ھی پڑی رھی۔ کبھی کبھار جب وہ بہت

کو پھر مولوی کے ہاں بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ تم پڑھنا سیکھ لو۔ پڑھنا سیکھ جاؤگے تو وہ قیمتی کتاب ہم کو پڑھکر سناؤگے جس کو ہم نے کتنے ہی برسوں سے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے۔ مرادجان نے میری بات چپ‌چاپ سنی لیکن گھر لوٹنے پر تیار نہ ہوا۔ اس نے کہا: "میں پڑھنے نہ جاؤں‌گا۔ اور مولوی اور ایشان کا تو منھ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ اب شہروں اور دیہاتوں میں سوویت اقتدار قائم ہو چکا ہے۔ اب مجھے آقچی ایشان کی بیوی لکڑیاں کاٹنے اور پانی لانے پر مجبور نہ کر سکے گی۔" میں اس کو سمجھانے لگا کہ ہمارے یہاں جو مولوی آیا ہے وہ استاد کہلاتا ہے۔ اس نے ایک خیمے میں اسکول کھولا ہے۔ تم جیسے بہت سے بچے اور بچے ہی نہیں کچھ بالغ بھی روز اس کے ہاں پڑھنے جاتے ہیں۔ تمہارے بارے میں تو استاد نے کہا ہے کہ مرادجان پڑھنے آیا کرے، جتنے دن مقرر ہیں اتنے ہی دنوں میں میں اس کو پڑھنا لکھنا سکھا دوں‌گا۔ میں نے کہا، استاد کوئی عام قسم کا مولوی نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو نئی حکومت لوگوں کو پڑھانے کے لئے خاص طور پر گاؤں گاؤں بھیجتی ہے۔ اس کو مزدوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ اور وہ اپنے علم کا بھی کوئی دام نہیں مانگتا۔

اس طرح سمجھا بجھاکر میں مرادجان کو گاؤں لے آیا اور اسکول بھیجنے لگا۔ استاد نے جو بات کہی تھی وہ سچ ثابت ہوئی۔ وہ آقچی ایشان سے بالکل مختلف تھا۔ نہ بڑھ چڑھ‌کر وعدے کرتا، نہ معجزے کرتا اور نہ

اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر تیار نہیں ہوئے۔ لیکن مجھے تو پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ بڑا لگاؤ ہو گیا۔ میں نے اس کو کتاب‌والی بات بتائی۔ اسے کتاب کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ میں نے نکال‌کر دکھائی۔ وہ کتاب کو لے گیا اور ایک دو دن اپنے پاس رکھ‌کر واپس کرتے وقت مجھ سے کہا:

"ویل‌مراد آغا! آپ نے کچھ برا سودا نہیں کیا ہے۔ پورا ایک خزانہ آپ کے ہاتھ آ گیا ہے۔ یہ ترکمانوں کی ایک بہت ہی بیش‌قیمت قلمی کتاب ہے۔ آپ میاں بیوی نے اس کی خاطر یونہی مصیبتیں نہیں جھیلی ہیں۔ یہ بہت دنوں تک بند رہی ہے لیکن اب کھل جائے گی۔ اب زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑے گا۔ آپ اپنے بیٹے کو اسکول بھیجئے۔ تھوڑے دنوں میں وہ لکھنا پڑھنا سیکھ جائے گا۔ وہ میرے ہاں لکڑیاں کاٹنے اور پانی بھرنے کا کام نہیں کرے گا جیسا کہ اس کو ایشان کے ہاں کرنا پڑتا تھا۔ مجھے مزدوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنے دن مقرر ہیں اتنے ہی دن وہ اسکول میں پڑھے گا اور پھر اپنے گھر میں اسی جگہ بیٹھ‌کر اپنے ماں باپ کو یہی کتاب پڑھ‌کر سنائے گا۔ دوسری کتابیں بھی ملیں گی، ان سب کو بھی وہ آپ لوگوں کو پڑھ‌کر سنائے گا۔ کچھ لکھنا ہو تو لکھ بھی دے گا۔"

مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ استاد کی یہ باتیں کھوکھلی نہیں ہیں۔ مرادجان صحرا میں جانے کہاں بھیڑوں کا گلہ چرا رہا تھا۔ میں اس کی تلاش میں نکلا۔ آخر وہ مل گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تم

تھا۔ اور جب خود میرے بیٹے نے یہیں اسی انگیٹھی کے پاس بیٹھکر آھستہ آھستہ اور سیدھے سادے طریقے سے ترکمانوں کے جیسے انداز میں پڑھکر سنایا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ کتاب پوری کی پوری کھل‌کر سامنے آ گئی۔ اس کے بعد میری بیوی پر اور ساتھ ھی ساتھ گاؤں‌والوں پر بھی واضح ھو گیا کہ ایک اونٹنی کے بدلے یہ کتاب لےکر ویل‌مراد نے کوئی کچا سودا نہیں کیا تھا۔

اس طرح میری بیوی کا رونا دھونا بھی بند ھو گیا۔ وہ جو آئے دن بڑبڑاتی رھتی تھی کہ "ھائے! ھم سے کتنی بھول ھو گئی۔ ھائے ھم اپنی شاندار اونٹنی سے ھاتھ دھو بیٹھے" اس جنجال سے میری جان چھوٹ گئی۔ ادھر گاؤں‌والوں نے میرے کچے سودے سے متعلق اپنے ھنسی مذاق کا سلسلہ بند کر دیا۔"

"تو یہ رھی اس کتاب کی کہانی" ویل‌مراد آغا نے اپنا قصہ ختم کرتے ھوئے کہا۔ "دیکھا تم نے بھلے نوجوان کہ اس کتاب کی وجہ سے ھمیں کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑی ھیں اور اس سارے قصے کا خاتمہ کیا ھوا ھے؟ یہ سب جاننے پر اس دولت کو مجھ سے چھین لینے کی کسے ھمت ھوگی؟ اگر میں نے یہ کتاب کسی کو دے دی تو گاؤں کا ھر آدمی مجھ پر لعنت بھیجےگا۔ یہ رھی کتاب۔ ساری کی ساری تمہارے سامنے ھے۔ پڑھو جتنا جی چاھے، جو بھی اسے سننا چاھے پڑھکر سناؤ! لیکن اس کو مجھ سے الگ کرنے کے خیال کو ھمیشہ ھمیشہ کے لئے اپنے دماغ سے نکال دو۔"

ھی نمک پھونکتا تھا۔ ھمارا بیٹا ھماری آنکھوں کے سامنے رھتے اور اپنی ماں کا ھاتھ بٹاتے ھوئے تھوڑے ھی دنوں میں لکھنا پڑھنا سیکھ گیا۔ ھاں چلتے چلاتے یہ بھی بتا دوں کہ مرادجان آجکل یہاں سے قریب ھی واقع مویشیوں کے ایک فارم کا سربراہ ھے۔

ھاں تو جب ھمارے بیٹے نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو اس نے اس کتاب کو تھیلے کی تہ سے نکالا اور اسے شروع سے آخر تک ھم کو پڑھ‌کر سنا دیا۔ تب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کتابوں کے اندر جو باتیں ھوتی ھیں وہ ھم جیسے عام آدمیوں کی سمجھ میں آ جاتی ھیں۔ معلوم ھوا کہ اس کتاب میں ایسے گیت بھی ھیں جن کو ھم چرواھے پہلے بھی جانتے اور صحراؤں میں خود گاتے پھرتے تھے۔ جیسا کہ تم خود دیکھ رھے ھو اس میں بہت سارے شعر ایسے ھیں جن میں اچھائی اور برائی کی باتیں کی گئی ھیں، زندگی میں جو سچ ھے اور جو جھوٹ، اس کی باتیں کی گئی ھیں اور سچائی کی خاطر لڑتے ھوئے لوگ جو جوانمردی دکھاتے ھیں اس کی باتیں کی گئی ھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ھو گیا کہ اس رات کو اس بیلچے جیسی داڑھی‌والے مولوی نے اس کتاب کو ٹھیک ڈھنگ سے نہیں پڑھا تھا۔ پڑھا کہاں تھا، زبان کو توڑمروڑ کر ناک سے گنگناتا رھا تھا۔ اس کا تلفظ ترکمانوں جیسا نہیں تھا۔ شاید عربی ڈھنگ سے لحن کے ساتھ پڑھ رھا تھا۔ پتہ چلا کہ جب میں نے یہ کتاب خریدی تو اگر اس کے اندر سو باتیں تھیں تو ان سو میں سے ایک بات بھی ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ پایا

"اگر آپ اس کتاب کو میرے ہاتھ بیچ دیں..."

"ارے رے رے!"

ویل‌مراد آغا ہنس پڑا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی کو سہلانے لگا۔ اس بار وہ ناراض نہ ہوا کیونکہ اس نے میری بات کو کچھ اہمیت ہی نہ دی۔ سمجھا کہ میں یونہی مذاق کر رہا ہوں۔ اس کا گونجدار اور لمبا قہقہہ سن‌کر اس کی بیوی نے جو انگیٹھی کے اس طرف بستر بچھاکر لیٹ چکی تھی، اپنا سر اٹھاکر ہماری طرف دیکھا اور پھر دوبارہ رضائی اوڑھ لی۔ بوڑھا بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ‌کر کہ میں اس کی کتاب پر عاشق ہو گیا ہوں وہ بڑا اطمینان محسوس کر رہا تھا۔

ہنس چکا تو اس نے کہا:

"میرے پیارے دوست اور عزیز مہمان! میں اسے نہیں بیچوں‌گا۔ کبھی نہیں بیچوں‌گا۔ کوئی ایسی کتاب کو بیچے تو سمجھو کہ وہ اس کی قیمت نہیں جانتا۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں، دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو کسی بھی قیمت پر کسی دوسرے کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔"

"مگر کسی نے تو اس کو آپ کے ہاتھ بیچ دیا.."

"تو اس نے نقصان اٹھایا!" بوڑھے نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔ یہ کہہ کر وہ پھر قہقہہ مارکر ہنس پڑا۔ وہ اپنی دولت پر بچوں کی سی خوشی اور فخر محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں آپ نے ٹھیک ہی کہا، ویل‌مراد آغا۔ ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو بیچی نہیں جاتیں" میں نے

۴

ویل‌مراد آغا اپنا قصہ ختم کرکے خاموش ہوا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ بوڑھا جیتے جی اس کتاب کو خود سے الگ نہ ہونے دے‌گا۔ اب اس سلسلے میں اس سے کچھ کہنا بےسود تھا۔ ہاں میں اس سے کہہ سکتا تھا کہ اگر یہ کتاب ہمیں مل جائے تو ہم عشق‌آباد میں اس کی بہت سی نقلیں بنوائیں‌گے اور اس گاؤں کا ہر ایک آدمی اس کتاب کی ایک جلد حاصل کر سکے‌گا۔ جہاں تک اس قلمی نسخے کا تعلق ہے، وہ دو تین مہینے کے اندر اندر ویل‌مراد آغا کو جوں کا توں واپس کر دیا جائے‌گا۔ میں یہ بات بوڑھے سے کہہ سکتا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ بوڑھا میری بات سنے‌گا ہی نہیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ جب کتاب اس کی زندگی میں اس طرح رچ بس گئی ہے تو کسی بھی دلیل کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ زیادہ آسان تو یہ ہوگا کہ کتاب کو نقل کرنے کی اجازت لی جائے۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی گھل مل گئے تھے، گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ چنانچہ چائے پیتے پیتے موقع پاکر میں نے اس سے کہا:

"ویل‌مراد آغا!"

"ہاں کہو، بھلے نوجوان۔"

"کیا آپ میری ایک خواہش پوری کریں‌گے؟"

"کہو، کیا خواہش ہے تمہاری؟"

3*

رہا۔ بوڑھا خود بھی اکثر و بیشتر میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ کبھی کبھی کوئی نظم حافظے سے سناتا تھا اور میں لکھتا تھا، باقی وقت یونہی مجھ کو لکھتے دیکھتا رہتا تھا۔ افسوس کرتے ہوئے کہتا تھا:

"پڑھنا تو میں نے سیکھ لیا ہے لیکن لکھنا شاید کبھی نہ سیکھ سکوں‌گا۔ اب دیر ہو چکی ہے۔"

بڑھیا ہم کو سبز چائے پلاتی، چوریک* کھلاتی اور کبھی کبھی نشیلے چال** سے ہماری تواضع کرتی تھی۔ ہم لوگوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ دو ہفتے تک میں رہیں ویل‌مراد آغا کے گھر ہی میں رہا۔ اپنی اصل قیام‌گاہ یعنی فارم کے چیرمین کے گھر بس کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔

۵

جو نظمیں ویل‌مراد آغا نے چالیس سال تک سنبھال کر رکھی تھیں وہ ایک مشہور ترکمان شاعر کی تخلیقات تھیں۔ میں ان کو نقل کرکے عشق‌آباد لے آیا۔ اس شاعر کے بہت سے دوسرے اشعار بھی محققین نے ترکمانستان کے دوسرے مقامات پر کھوج نکالے تھے۔ ان سب کو یکجا کیا گیا ہے۔ جلد ہی اس شاعر کا مجموعہ کلام منظرعام پر آ جائےگا۔ میں اس دن کا بڑی بےصبری سے انتظار کر رہا ہوں۔ چھپتے ہی میں اس کی دس جلدیں

---

* تندوری روٹی۔

** اونٹ کا کھٹا دودھ۔

اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "مگر بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اگر مالک کو کسی آدمی پر بھروسہ ہو تو اپنی قیمتی چیز کو کم سے کم کچھ دنوں کے لئے اس آدمی کو دے دے۔"

میں بوڑھے کو یہ جتا دینا چاہتا تھا کہ میں اس کے پاس سے خالی ہاتھ جانےوالا نہیں ہوں۔ ہم بڑی سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے، ایک دوسرے کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے چنانچہ آخرکار بوڑھے کو مجھ پر رحم آ گیا اور اس نے کہا:

"بھلے نوجوان! میرے عزیز مہمان! اگر تم کو میری کتاب سے اتنا ہی زیادہ عشق ہو گیا ہے تو یہیں انگیٹھی کے پاس بیٹھکر اس کو نقل کر لو۔"

بوڑھے نے یہ بات کہہ دی اور اس کے بعد خیمے کے اندر خاموشی چھا گئی۔ خیمے کے باہر بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ریگستان میں پو پھٹنے کے وقت یہی عالم ہوتا ہے۔ انگیٹھی کی آگ بھی کبھی کی بجھ چکی تھی اور راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ انگیٹھی کے اس طرف ویل‌مراد آغا کی بیوی رضائی اوڑھے سو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ہماری گفتگو یہیں ختم ہونی چاہئے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ، ویل‌مراد آغا۔ تو کل صبح ہی سے میں یہیں بیٹھکر کتاب کو نقل کرنا شروع کر دوں‌گا۔"

یہ کہہ‌کر میں چلا آیا۔

میں برابر دو ہفتے تک ویل‌مراد آغا کی انگیٹھی کے پاس بیٹھا اس کے بیش‌قیمت قلمی نسخے کو نقل کرتا

3—3078



بیکی سیتاکوف

جد و جہد

(کہانی)

رات ڈھل چکی تھی۔ چاند کا آتشیں گولا مغرب کی طرف نیچے اترتا جا رہا تھا۔ فضا میں ریت کے چبھنےوالے لاتعداد ذرے اڑ رہے تھے۔ ہلکی، موہوم دھند کے پردے میں تارے عجیب و غریب انداز سے ٹمٹما رہے تھے۔ قراقم ریگستانوں کے بیچوں بیچ وسیع و عریض نشیبی میدان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بس رہ رہ کر کتوں کے بھونکنے کی خوابآلود آوازیں اور بھیڑوں اور اونٹوں کے مسلسل جگالی کرنے کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

سپرلی دن بھر چلتے چلتے بہت تھک گیا تھا اور اب ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی مردے کی طرح بےحس و حرکت پڑا سو رہا ہے۔ لیکن بےکنار ریگزاروں کی آغوش میں پل کر بڑے ہونےوالے ترکمانی باشندے عالمخواب میں بھی چوکس رہتے ہیں۔ سپرلی کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کے اپنے نمدے کے بستر کو الٹا تو اس کے نیچے سے ایک سیاہ سانپ غصے سے پھنکارتا ہوا نکل آیا۔

لےکر ویل‌مراد آغا کے گھر پہنچوں‌گا جنہیں دیکھکر بوڑھا یقیناً کہہ اٹھےگا:

"دیکھتا ہوں کہ میری کتاب کو جس کے ایک ایک لفظ کی قیمت ایک اونٹنی کی قیمت کے برابر ہے تم نے یوں ہی نقل نہیں کیا تھا۔"

میں بھی اس سے کہوں‌گا کہ ہاں اب اس کتاب کو صرف ایک آدمی نہیں، صرف دس بیس افراد نہیں بلکہ پوری ترکمان قوم پڑھےگی۔ پھر دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائےگا۔ ماسکووالے، تاشقندوالے، یوکرین کے لوگ، قفقاز کے لوگ اور دوسرے بہت سے لوگ اس کو پڑھیں‌گے۔ تمام سوویت عوام بلکہ دنیا کے تمام متمدن لوگ ہمارے ترکمانی ادب کے اس بیش بہا خزانے سے فیض اٹھائیں‌گے۔ خزانہ جو جفاکش اور آزادی کے دلدادہ ترکمان عوام کی قربانیوں، جوانمردی اور جاں‌نثاری کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ویل‌مراد آغا خود بھی نیا جنم لینےوالی اپنی اس کتاب کو کچھ اور شوق اور لگن سے، کچھ اور زیادہ سمجھ بوجھ کے ساتھ دوبارہ پڑھ لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس کتاب کو وہ اتنے دنوں سے تھیلے کی تہ میں سنبھال‌کر رکھے ہوئے ہے، اپنی مرضی سے میرے حوالے کر دے۔ یہ ایک عجیب و غریب قلمی کتاب ہے۔ اس میں ترکمانی ادب کے شاعر مختوم‌قلی کے بیش‌بہا اشعار محفوظ ہیں۔

بھی اپنے دل و دماغ سے جھٹک دینے کے لئے زور زور سے کچھ کسرت کی پھر کرتے کے اوپروالے بٹن کھول دئے اور سرد ھوا میں گھری گھری سانسیں لیں۔ پو پھٹ رھی تھی۔ نیند سے بیدار ھوتے ھوئے ریگستان کو دیکھتے دیکھتے سپرلی پر خواب و خیال کی کیفیت طاری ھو گئی۔

سپرلی کا ھمسفر سیہیت جو دن بھر تپتی ھوئی ریت پر چلتے چلتے چور ھو گیا تھا، گھری نیند سو رھا تھا۔ "آرام سے سوتا رھے" سپرلی نے دل ھی دل میں سوچا۔ ان دونوں کو سفر پر نکلے پندرہ دن ھو چکے تھے۔ ریگستان میں بھی سپرلی ایسے ھی چلتا تھا جیسے اپنے گھر آنگن میں چل پھر رھا ھو۔ وہ کوئی چھوٹا سا نشان دیکھ‌کر بھی راستے کو پا لیتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جہاں انھوں نے یہ رات بسر کی ھے وھاں سے ان کے گھر تک ابھی پندرہ دنوں کا فاصلہ ھے۔ کاش یہ بیحد طویل اور تپتے ھوئے دن جلد سے جلد گزر جائیں! کاش وہ اجتماعی فارم کی اس گوشت و پوست کی زندہ دولت کو جلد سے جلد اور بخیر و عافیت لے جاکر فارم‌والوں کے حوالے کر دیں!

راستے بھر بھیڑوں کو چرانے اور ان کی حفاظت کرنے کا کام صرف سپرلی اور سیہیت ھی کے ذمے نہیں ھے۔ ان کو چاروں طرف سے دن رات چار کتے بھی اپنے گھیرے میں لئے رھتے ھیں۔ ان کے نام ھیں آلابائے، میلےقوش، سری‌بائے اور آق‌بائے۔ اس وقت وہ چاروں انہی جگھوں پر لیٹے ھوئے ھیں جہاں کل شام کے وقت

سپرلی نے اس خطرے کی بالکل پروا نہ کی جو ابھی ابھی اس کو لاحق تھا۔ اسے تو یہ سوچ کر سانپ پر غصہ آنے لگا کہ اس نے ایک آدھ گھنٹہ اور سونے نہ دیا۔ پہلے اس کے دل میں خیال آیا کہ سانپ کو پکڑ کر مار ڈالے لیکن پھر اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس نے اتنے زور سے انگڑائی لی کہ بدن کی ہڈیاں چرمرا اٹھیں۔ وہ نہ جانے کیا سوچ کر مسکرایا اور پھر ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔

سامنے ریگستان بالکل خاموش پھیلا ہوا تھا۔ چاند کا گولا افق پر ریت کے ٹیلوں کے لہریے کو چھو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پو پھٹ رہی تھی۔ آسمان کا مشرقی سرا ایک عجیب قسم کی سفیدی میں رنگا جا رہا تھا۔ سپرلی نے شمال کی طرف نظر ڈالی تو بےساختہ چونک اٹھا۔ ریت کے وہ متعدد گول گول ٹیلے جو غروب آفتاب کے وقت اس طرف نظر آ رہے تھے، غائب ہو چکے تھے۔ اب اس طرف سکساؤل کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے دھند میں لپٹی ہوئی ایک اتھاہ اور خاموش خلا پھیلی ہوئی تھی۔ گرد و پیش کے ریتیلے ٹیلوں اور جھاڑیوں کے سائے بڑی تیزی سے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن اچانک چاند بالکل چھپ گیا اور سب سائے غائب ہو گئے۔ مشرق کی طرف آسمان میں ایک بہت ہی ہلکی گلابی دھاری نمودار ہوئی۔

سپرلی کے دل میں جو بیچینی پیدا ہونے لگی تھی وہ دور ہو گئی۔ اس نے نیند کے بچے کھچے اثرات کو

رهی تھیں اور پانی کی سطح پر هلکی هلکی سی لہریں اٹھ رهی تھیں۔ اوپر نیلا آسمان تھا اور چمکتا هوا سورج مغرب کی طرف نیچے اترتا جا رها تھا۔ اینےجان آهسته آهسته، هلکے هلکے قدموں سے چل رهی تھی۔ کتنی خوبصورت لگ رهی تھی اس شام کو وہ! اینےجان کے گھنگریالے سیاہ بال چوکور ٹوپی کے نیچے سے نکل‌کر اس کے شانوں پر لہرا رهے تھے۔ اس کی آنکھیں کچھ نمی لئے هوئے چمک رهی تھیں۔

"اینے! میری جان!" سپرلی نے لڑکی کے هاتھ کو سختی سے تھام‌کر کہا تھا۔ "تم جانتی هی هو که میں تم سے کیا کہنے کے لئے بےقرار هوں... آخر وہ دن کب آئے گا؟"

"جب تم لوٹ آؤگے تب هم اس کے متعلق بات کریں گے" اینےجان نے جواب دیا۔

سپرلی نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال‌کر دیکھا۔ اس نے سپرلی کا هاتھ سختی سے تھام‌کر ایک پرسکون اور پرمحبت نگاہ سے جواب دیا۔ اس نگاہ میں سفر سے متعلق ایک سچے دوست کی نیک خواهشات جھلک رهی تھیں۔

"سپرلی! تمہارا سفر کامیاب رهے۔ فارم کے مویشیوں کو صحیح سلامت پہنچا دو۔ اپنا خیال رکھنا اور... اپنے ساتھی کا بھی۔"

وہ یه کہتے هوئے کھلکھلاکر هنس پڑی۔ سپرلی بھی سچے دل سے اس کے ساتھ مل‌کر هنسنے لگا۔ سپرلی کے فارم‌والے نوجوان دوست، ینگ کمیونسٹ لیگ کے ممبر

سپرلی نے ان کو مامور کیا تھا۔ وقتاً فوقتاً ان میں سے کوئی اٹھکر گلے کے گرد ایک چکر لگاتا اور پھر اپنی جگہ پر آکر لیٹ جاتا ہے۔

ڈیڑھ ھزار بھیڑوں کے جگالی کرنے کی جو مسلسل آواز سپرلی کے کانوں میں پڑ رھی تھی اس سے اس کی آنکھوں کے سامنے اس صبح کا منظر پھر گیا جب وہ لوگ فارم سے سفر پر روانہ ھو رھے تھے۔ روانگی سے قبل سپرلی اپنی محبوبہ اینےجان سے ملاقات کرنے کے لئے ریشم کے کیڑوں کی پرورش‌گاہ میں گیا تھا جہاں اینےجان ریشم کے کیڑوں کو کھلا رھی تھی۔ کیڑے تیسری نیند سے ابھی ابھی بیدار ھوئے تھے اور شہتوت کی تازی پتیوں کو بڑے اشتیاق سے کتر کترکے کھا رھے تھے۔ وھاں بھی سپرلی نے کچھ ایسی ھی سرسراھٹ سنی تھی۔ بہار میں ھلکی ھلکی بارش کی جو آواز ھوتی ھے بس ویسی ھی آواز۔ اور اینےجان...

اینےجان کی یاد آتے ھی سپرلی کو ایسا لگا جیسے اس کی محبوبہ اس کے پاس کھڑی ھوئی اپنی کالی کالی آنکھوں سے اس کو تکے جا رھی ھو۔

سپرلی کو یہ بھی یاد آیا کہ سفر پر نکلنے سے ایک دن پہلے اس نے اور اینےجان نے کس طرح بڑی نہر کے کنارے کنارے سیر کی تھی۔

ھرے بھرے درختوں کی دو قطاریں دور دور تک چلی گئی تھیں اور ان کے درمیان صاف اور شفاف پانی شور کرتا ھوا بہہ رھا تھا۔ ھوا کے ھلکے ھلکے جھونکوں سے درختوں کی ھری بھری چمکیلی پتیاں مسلسل ھل

تک نہ پہنچ سکے تو جانور مر جائیں گے۔ انہوں نے تو دو دن سے پانی نہیں پیا ہے۔"

سپرلی نے جلدی جلدی لکڑیوں کا ڈھیر لگاکر آگ جلائی اور کونچی* میں پانی بھرکر آگ پر رکھ دیا۔ اتنے میں سیہیت نے دو تین کروٹیں لیں اور بس۔ لیکن بالآخر اسے کراھتے اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھنا ھی پڑا۔

دونوں چائے پینے بیٹھے۔ اتنے میں اچانک ایسی امس ہو گئی کہ ان کے دم گھٹنے لگے۔ پہلے تو سپرلی نے سوچا کہ پانی میں چائے کی جگہ "اشقین" گھاس ڈالی گئی ہے اور یہ اسی کا اثر ہے اس لئے اس کی زیادہ پروا نہ کی۔ لیکن امس اور گھٹن کم نہ ہوئی، بڑھتی گئی۔ پو پھٹنے کے وقت جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی وہ بالکل بند ہو چکی تھی اور اگرچہ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا لیکن ریت گرم ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے انسان ویسے جانور سب بےچین ہو اٹھے۔ کتوں نے گھبراکر بھونکنا اور بھیڑوں نے ممیانا شروع کر دیا۔ اونٹ بھی اٹھ گئے اور ریت پر پاؤں پٹکنے لگے۔ اور تو اور، گدھے تک جو عموماً کسی چیز کی پروا نہیں کرتے، ڈھینچو ڈھینچو کرنے لگے اور پھر سب نے اپنی اپنی دم کو تان کر زور زور سے ھانک لگانا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کی واضح علامت تھی کہ ریت کی آندھی آ رہی ہے۔ سپرلی نے بڑی فکرمندی سے اپنا سر ھلایا۔

---

* دھات کا اونچے گلےوالا برتن جو کیتلی کا کام دیتا ہے۔

سب ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ سپرلی کے ہم‌سفر سیہیت کے کردار سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

تین افراد نے جو سپرلی کو بہت عزیز تھے اس کو اس طویل سفر پر رخصت کیا، فارم کی ایک بڑی دولت کو اس کے سپرد کیا۔ یہ تھے کومسومول کمیٹی کا سکریٹری، اجتماعی فارم کا چیرمین اور اس کی اپنی محبوبہ۔ ان تینوں نے سپرلی کو ایک ھی بات کی تاکید کی۔ وہ بالکل جوان تھا، پھر بھی ایک بڑا مشکل کام اس کے سپرد کیا گیا تھا، قراقم کو پار کرکے ایک دو نہیں، ڈیڑھ هزار بھیڑوں کو اهال سے خیوا تک پہنچانا تھا۔ ایسی ذمےداری کا کام بہت سوچ سمجھ‌کر ھی کسی کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔

سپرلی ریت کے ٹیلے پر بت بنا کھڑا تھا اور شمال کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

اس کے ذهن کے پردے پر یادیں ایک ایک کرکے ابھر رهی تھیں — پردہ سیمیں پر تصویروں کی طرح۔ اسے یقین تھا کہ فارم‌والوں اور اس کی محبوبہ نے اس سے جو امید باندھ رکھی ھے اس کی کسوٹی پر پورا اترے‌گا۔

سپرلی ٹیلے سے اترکر اپنے ساتھی کو جگانے لگا: "سیہیت! ارے او سیہیت! اب اٹھو نا۔ چاند چھپ چکا ھے۔ پو پھٹ رهی ھے۔ همارے چائے پیتے پیتے بالکل اجالا هو جائے‌گا۔ جلدی چل دینا چاهئے۔ ارے اٹھو بھی! هم لوگ سورج غروب هوتے هوتے ینداق‌لی

لیکن پھر اس نے ہمیشه کی طرح مایوس ھوکر اس کا خیال چھوڑ دیا۔

سپرلی بڑا ھوشیار اور باتدبیر آدمی تھا اور کیسے بھی حالات کیوں نه ھوں اپنے ھوش و حواس درست رکھتا تھا۔ چنانچه اس خیال سے که کہیں یندا‌ق‌لی کنوئیں کا راسته بھول نه جائے، اس نے اپنے چرواھوں‌والے بڑے چھرے کو نکال‌کر ایک جھاڑی کے نیچے اس طرح گاڑ دیا که اس کا دسته شمال کی طرف رھے۔ پھر اس نے چاروں کتوں کو آواز دی، سب کے سروں پر ھاتھ پھیرکر لاڈ پیار کیا اور گلے کے چاروں طرف مختلف جگھوں پر ان کو بٹھاکر سختی سے کہه دیا که ھلنا مت۔

سورج کبھی کا طلوع ھو چکا تھا لیکن اندھیرا گہرا ھوتا جا رھا تھا۔ گرم ھوا چل پڑی اور ریت کھرے کی طرح ٹیلوں کی چوٹیوں کے اوپر منڈلانے لگی۔ ادھر شمال کی طرف سے ایک سیاہ بادل بڑی تیزی سے بڑھتا آ رھا تھا۔ آسمان میں بجلیاں چمکنے لگیں، کہیں دور سے گرج بھی سنائی دی۔

کوئی ایک ھی دو منٹ کے اندر سپرلی جانوروں کے پورے گلے کا چکر لگا آیا۔ اس نے جانوروں کو سمیٹ‌کر ان کو ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ سٹاکر بٹھا دیا۔ اس درمیان سیھیت بس اتنا ھی کر پایا که سامان جمع کرکے اسے باندھ دیا۔ اس پر بھی اس نے سپرلی پر طنز کرتے ھوئے کہا:

"ارے سپرلی! یه تم اس طرح بھاگے بھاگے کیوں

جس بات کا اسے سب سے زیادہ ڈر تھا وہی ہونے والی تھی۔

"دیکھو، سیہیت! ذرا شمال کی طرف دیکھو!" سپرلی نے اپنے ساتھی سے جوش سے کہا۔ "ہماری حالت خراب ہونے کو ہے۔ چائے جلدی پی لو اور کام میں لگ جاؤ۔"

شمال کی طرف افق پر جو دھند سی نظر آ رہی تھی اس نے دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹا کی شکل اختیار کر لی تھی اور لمحہ بہ لمحہ قریب سے قریب‌تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھڑسواروں کا کوئی بہت بڑا فوجی دستہ سرپٹ دوڑتا ہوا ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ آسمان پر بادل ہی بادل بڑی سرعت سے تیر رہے تھے۔ ہوا کے زوردار جھونکوں سے وہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتے اور کبھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ ایک عجیب و غریب شکل کی کالی گھٹا ہوا کے زوردار دھکے کھاکر کبھی اس طرف کو دوڑتی، کبھی اس طرف کو۔

سپرلی نے بہت جلدی اپنے پر قابو پا لیا کیونکہ چند ہی لمحوں کی بےعملی یا سستی خود اس کے، اس کے ساتھی کے اور جانوروں کے گلے کے لئے جو اجتماعی فارم کی دولت تھا، بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

"جلدی سے چلنے کی تیاری کرو" اس نے سیہیت سے چلاکر کہا۔ وہ گول مٹول اور بھاری بھرکم آدمی ہمیشہ کی طرح بالکل نامناسب طور پر بےپروائی برت رہا تھا۔ یہ دیکھ‌کر سپرلی کو اس پر غصہ آنے لگا

سے بچنے کے لئے سر کو اپنے چوغے کے نیچے چھپا لیا۔

آندھی زور پکڑتی گئی۔ وہ سیٹیاں بجاتی ہوئی سکساؤل کی جھاڑیوں سے گزر رہی تھی اور ان کی خشک ٹہنیوں کو تڑاخ تڑاخ توڑ رہی تھی۔ سپرلی اور سیہیت دونوں اونٹوں کے بیچ زمین سے لگے پڑے ہوئے تھے۔ سپرلی بےحد گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بڑی بیچینی سے کروٹیں بدل رہا تھا، دانتوں کو کٹکٹا رہا تھا۔ اور سیہیت کو تو یہ قیامت کی آندھی بھی ٹس سے مس نہیں کر پائی تھی۔ وہ تو اپنے سرخ سرخ بالوں والے اونٹ سے چمٹ کر دنیا و مافیہا کی طرف سے آنکھیں بند کرکے گہری نیند سو گیا تھا۔

ہوا پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ آندھی ریت کے ٹیلوں کی چوٹیوں کو اٹھا لیتی اور بڑی سرعت سے اڑاتی ہوئی لے جاکر کھڈوں کھائیوں میں پٹک دیتی۔

سپرلی ذرا زور لگاکے اٹھکر بیٹھ گیا۔ سکساؤل کی سوکھی ٹہنیاں ریت کے ساتھ اڑتی ہوئی اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اونٹ جس سے سپرلی چمٹا بیٹھا تھا، مشکل سے سانس لے رہا تھا اور بیچینی سے ہل رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنا سر اٹھاکر سر اور گردن پر جمی ہوئی ریت کو جھٹک دیتا تھا۔ سپرلی یہ دیکھنے کے لئے کہ جانوروں پر کیا بیت رہی ہے اٹھ کھڑا ہوا لیکن جونہی اپنا سر چوغے سے باھر نکالا ہوا کے ایک زوردار جھونکے سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگاکر آندھی کے اس حملے کو تو

پھر رہے ہو؟ کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہے ہو کیا؟"

سپرلی کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ یہ جھگڑا کرنے کا وقت نہیں۔ اگر اس وقت چاروں طرف آگ لگی ہوتی تو بھی شاید سیہیت اسی بےپروائی سے پوچھتا کہ سپرلی، تمھارا کیا خیال ہے، ہم کتنی دیر میں جل کر راکھ ہو جائیں گے؟ سپرلی سیہیت کو بچپن ہی سے جانتا تھا اور اس کو یقین تھا کہ سیہیت ہمیشہ سیہیت ہی رہے گا۔ اس لئے اس نے آہستہ سے کہا:

"جلدی سے اونٹوں کو بٹھا دینا اور گدھوں کو ہانک کر بھیڑوں کے پاس لے جانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر سپرلی اونٹوں کو بٹھانے لگا۔ جب تک سیہیت نے ایک گدھے کی رسی کھولی تب تک اس نے چار اونٹوں کو بٹھا دیا اور پانی کے برتنوں اور باقی سامان کو نمدے سے ڈھک دیا۔

سکساؤل کے پودے ہوا کے زور سے زمین تک جھک گئے۔

"لو آ گئی!" سپرلی نے اپنے ساتھی سے چیخ کر کہا۔

سچ مچ ہی قیامت آ گئی!

آندھی ریت کی لہروں کو اٹھا اٹھاکر آسمان تک لے جانے اور کالے کالے بادلوں کو زور زور سے زمین پر پٹکنے لگی۔ سپرلی اپنے لمبے لمبے بالوں والے پیارے اونٹ سے لپٹ گیا اور تپتی ہوئی ریت اور آندھی

ترکیب سوجھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر کسی بھیڑئیے کی لمبی اداس سی آواز ریگستان میں گونج اٹھی۔

کتے فوراً ھی اٹھے اور اپنے ازلی دشمن کا سامنا کرنے کی تیاری کرتے ہوئے جانوروں کے گلے کے ارد گرد چکر لگانے لگے۔ بھیڑیں بھی کھڑی ھو گئیں۔ سپرلی نے ایک بار پھر بھیڑئیے کی آواز نکالی۔ اب بھیڑیں سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ سپرلی کو جب یہ یقین ھو گیا کہ بھیڑوں نے اپنے اوپر جمی ہوئی ریت جھٹک دی ھے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ بھیڑئیے کی آواز پھر نہ سنائی دی تو بھیڑوں کو چین آ گیا۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ کتے اور بھیڑیں سب دوبارہ بیٹھ گئے اور ایک بار پھر ان کے اوپر ریت کی تہیں جمنے لگیں۔

دوپہر ھوتے ھوتے آندھی کا زور گھٹ گیا۔ کالے بادل اوپر اٹھ گئے۔ چاروں طرف پھر روشنی پھیلنے لگی۔ آندھی جس طرح شروع ھوئی تھی اسی طرح اچانک رک بھی گئی۔ قراقم کے بےکنار ریتیلے میدان ایک بار پھر پرسکون اور خاموش ھو گئے۔ ریت کے سپاٹ میدانوں اور ٹیلوں ڈھلانوں پر جو عجیب و غریب قسم کی لہریں نظر آ رھی تھیں صرف وھی اس بات کا ثبوت تھیں کہ ابھی ایک ھی گھنٹے پہلے آندھی نے ریگستان کو کسی بپھرے ھوئے سمندر کی شکل دے دی تھی۔

سپرلی نے چیخ چلاکر بھیڑوں کو اٹھایا۔ پھر اس

برداشت کر لیا لیکن ایک ھی لمحے بعد دوسرا زوردار حملہ ھوا تو اس کی تاب نہ لا سکا۔ اسے ھوا نے زمین پر سے اٹھاکے کئی قدموں کے فاصلے پر جا پھینکا جہاں وہ ریت کے میدان پر لڑھکنے لگا۔ اس نے زور لگاکر سکساؤل کی ایک ٹہنی کو پکڑ لیا لیکن وہ ٹوٹ گئی اور آندھی نے اس کو اس نشیب میں ڈھکیل دیا جہاں بھیڑیں چھپی پڑی تھیں۔ ذرا دیر دم لینے کے بعد سپرلی نے منھ میں بھری ھوئی ریت کو تھوک دیا اور آھستہ سے آنکھیں کھول‌کر ادھر ادھر دیکھا۔ بھیڑیں ایک دوسرے سے سٹی ھوئی سروں کو ایک دوسرے کے نیچے چھپائے پڑی ھوئی تھیں۔ وہ ریت سے اس طرح اٹ گئی تھیں کہ ان کی پیٹھیں اور دمیں ھی دکھائی دے رھی تھیں۔ گدھوں اور کتوں کو سپرلی نہ دیکھ پایا: گرم ھوا کے ایک جھونکے نے اسے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سپرلی کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رھا تھا۔ بھیڑوں کا اس حالت میں پڑے رھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ان پر ریت کی اتنی موٹی تہ جم گئی تھی کہ ان کے لئے سانس لینا بہت مشکل ھو گیا تھا اور وہ ڈر کے مارے اس ریت کو اپنے اوپر سے جھٹک دینے کی کوشش تک نہیں کر رھی تھیں۔ آندھی اگر آدھ گھنٹہ اور اسی طرح چلتی رھتی تو ساری بھیڑیں دم گھٹنے کے باعث مر جاتیں۔ انھیں تھوڑی دیر کے لئے ھی کیوں نہ سہی اٹھانا ضروری تھا۔ لیکن کس طرح؟

تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد سپرلی کو ایک

جس کے نیچے اس نے چھرے کو گاڑ دیا تھا نہ ملنی تھی نہ ملی۔ آندھی نے شاید اس کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ دراصل آندھی نے ریگستان کی صورت ھی بالکل بدل دی تھی۔ جس جگہ صبح ریت کا ایک اونچا ٹیلا موجود تھا وھاں اب ایک سپاٹ سا میدان پھیلا ھوا تھا اور جہاں پہلے قدرے گہری نشیب اور سکساؤل کی جھاڑیاں تھیں اب وھاں ٹیلوں کا پورا ایک سلسلہ بن گیا تھا۔

بالآخر جب چھرا ملنے کی کوئی امید نہ رھی تو سپرلی بھاری بھاری قدم اٹھاتا ھوا واپس سیہیت کے پاس آ گیا۔ سیہیت اپنے سوجے ھوئے پیروں میں دوران خون کو بحال کرنے کی فکر میں ٹیلوں کے درمیان یونہی بےمقصد گھوم پھر رھا تھا۔ "یہ کتنا خوش‌قسمت ھے! صورت‌حال کتنی سنگین ھے لیکن اسے تو کسی بھی چیز کی فکر نہیں ھے" سپرلی نے دل ھی دل میں سوچا۔

سورج بدستور بادلوں کے دبیز پردے کے پیچھے چھپا ھوا تھا۔ سپرلی بےحد فکرمند ھو رھا تھا کہ چھرا نہ ملا تو کنوئیں کی سمت کا تعین کرنا ناممکن ھو جائےگا۔ دن آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا اور یہ صاف ظاھر تھا کہ چاھے جتنی جلدی کی جائے، رات ھوتے ھوتے پانی تک پہنچنا ناممکن ھے۔ اور ان بھیڑوں کے لئے جن کو پانی پئے دو دن سے زیادہ ھو چکا تھا، یہ بات آندھی سے بھی زیادہ جان‌لیوا ثابت ھو سکتی تھی۔

سپرلی کو قریب آتے دیکھ‌کر سیہیت نے اس سے کہا:

"بڑی مصیبت میں پھنس گئے ھم، سپرلی! لکڑی

نے اپنا چوغا، کرتا، جوتا سب کچھ اتار کر ریت جھاڑی۔ اس کے بعد وہ اس ٹیلے پر چڑھا جہاں سیہیت اپنے اونٹ کے بغل میں دبکا ہوا آرام سے خراٹے بھر رہا تھا۔ سپرلی نے بڑی مشکل سے اس کو جگاکے پوچھا:

"سیہیت! تم زندہ تو ہو نا؟"

اس کی آواز میں ناراضگی اور شکایت کا شائبہ تک نہ تھا۔ سیہیت پر ابھی نیند کا غلبہ تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑکر سپرلی کے منھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"تمہیں جاگے دیر ہو گئی ہے کیا؟"

اس سوال سے زیادہ احمقانہ بھلا اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ وہ لوگ اپنے گھر میں ہوتے تو سپرلی سیہیت کے اس سوال پر خوب جی بھرکر ہنستا۔ لیکن اس وقت ہنسنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سپرلی کے دل میں ویسا ہی ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا جیسا ابھی تھوڑی دیر پہلے ریگستان میں آیا ہوا تھا لیکن اس دفعہ بھی وہ ضبط کر گیا۔ اس نے دوسرے تیسرے درجے کے کچھ کام سیہیت کے سپرد کئے اور خود زیادہ اہم کاموں میں لگ گیا: اس نے پھرتی سے اونٹوں کو رسیوں سے آزاد کرکے کھڑا کر دیا اور پھر ریت میں گاڑے ہوئے اپنے چھرے کی تلاش کرنے لگا تاکہ اس کی مدد سے اس کنوئیں کی سمت کا تعین کر سکے جہاں انہیں پہنچنا تھا۔ وہ دیر تک تلاش کرتا رہا، ہر ابھری ہوئی جگہ کو بغور دیکھا لیکن وہ جھاڑی

بغیر پانی کے ریگستان میں رہنا کتنی خطرناک بات ہے خاص طور پر اتنے سارے جانوروں کی ذمےداری اپنے اوپر لئے ہوئے۔

"اب ہم کیا کریں گے؟" اس نے بڑی گھبراہٹ سے سپرلی سے پوچھا۔

سپرلی کے تیور چڑھ گئے۔ سیہیت کا سوال بالکل نامناسب تھا۔ ترکمان لوگ کسی خطرے کے وقت اس قسم کے سوال نہیں کیا کرتے۔ ایسے سوالوں کا جواب نہیں دیا جاتا، سوال ہی کو بزدلی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور کسی بانکے جوان کے لئے بزدل مشہور ہونے سے تو مر جانا ہی اچھا ہے۔ جب سر پر مصیبت آن پڑتی ہے تو بزدل ساتھی کے سوا بدترین چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ سیہیت کا دل ذرا مضبوط کرنے کے لئے سپرلی نے کہا:

"ہم پہلے یینداق‌لی کے کنوئیں پر اور پھر وہاں سے چل‌کر گھر پہنچیں گے۔ اور کیا کرنا ہے ہمیں؟"

سپرلی کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے سیہیت سے پوچھا:

"تمہارا کیا خیال ہے، یینداق‌لی کس طرف ہوگا؟"

سیہیت کو بڑا تعجب ہوا:

"ارے کیا ہم خیوا کی طرف نہیں جا رہے ہیں؟ تم راستے سے بھٹک گئے ہو کیا؟"

"نہیں تو" سپرلی نے حتی‌الامکان متوازن لہجے میں جواب دیا۔ "میں تو بس یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں راستہ معلوم ہے کہ نہیں۔ اچھا اب یہ باتیں

کے برتن پھٹ گئے اور سارا پانی بہہ گیا۔ بس ایک ھی برتن میں آدھے سے کم پانی باقی رہ گیا ھے۔"

صورت‌حال ایسی تھی کہ ھوش و حواس کھو بیٹھنا کوئی بڑی بات نہ تھی!

سپرلی اور سیہیت دونوں سفر کی تیاری میں مصروف ھو گئے جو تقریباً گھنٹے بھر میں مکمل ھو گئی۔ انہوں نے بھیڑوں کو کھڑا کیا، اونٹوں پر کاٹھیاں کس‌کر سامان لادا اور جانوروں کو ھانکتے ھوئے ایک طرف کو چل دئے۔ کہاں جا رہے ھیں اس کا ان کو کوئی پتہ نہ تھا۔ سپرلی جانوروں کے گلے کے پیچھے پیچھے چپ‌چاپ چلا جا رھا تھا۔ فکر و پریشانی کے مارے اس کا دل پھٹا جا رھا تھا پھر بھی وہ حتی‌الامکان اپنے ساتھی کو تسلی دینے کی کوشش کر رھا تھا۔

سیہیت کا ھمت ھار بیٹھنا، بزدلی دکھانا تو موجودہ حالات میں سب سے بری بات ھوتی۔ سیہیت کتنا بھی سست اور کاھل کیوں نہ رھا ھو، اس قسم کے سفر کے لئے بےحد موزوں تھا۔ وہ ایک انوکھی جسمانی طاقت، حد درجہ صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل کا بیباک آدمی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے جوشیلے اور ھوشیار ساتھی سپرلی کی بات ماننے کے لئے ھمیشہ تیار رھتا تھا۔

لیکن اب حالت کی انتہائی سنگینی کو محسوس کرکے سیہیت بھی بہت گھبرا گیا تھا۔ وہ قراقم سے بخوبی واقف تھا، اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسے زمانے میں جب موسم‌گرما اپنے نقطۂعروج پر پہنچ گیا ھے

لیتا تھا لیکن کام کے سلسلے میں عقل لڑانے کی اس میں ذرا بھی سکت نہیں تھی اور شاذ و نادر ھی کسی کام کو اپنی مرضی سے ھاتھ میں لیتا تھا۔

اب قراقم ریگستان پر پندرہ دن تک مسلسل چلتے رھنے کے بعد بھی سپرلی کا حلیہ بالکل ویسا ھی تھا جیسا سفر کے پہلے دن تھا۔ وہ پوری سلیقہ شعاری کا ثبوت دے رھا تھا اور چست و مستعد نظر آ رھا تھا۔ اور سیہیت تھا کہ گدھے پر بھی ٹھیک طرح سے نہیں بیٹھ پا رھا تھا۔ کبھی اس طرف کو سرک جاتا، کبھی اس طرف کو۔ اس کے جوتوں کے فیتے کھل گئے تھے اور زمین تک لٹک رھے تھے اور چوغے کا پھٹا ھوا دامن اس طرح جھول رھا تھا جیسے کسی پرندے کا ٹوٹا ھوا بازو ھو۔

لیکن سیہیت کو اس سب کا بالکل خیال ھی نہیں آتا تھا۔ جمالیاتی ذوق نام کی چیز بھی اس کے اندر بالکل خوابیدہ سی پڑی تھی، بالکل ویسے ھی جیسے عشق و محبت کا پاکیزہ جذبہ اس میں ابھی تک بیدار نہیں ھو پایا تھا۔ اس وقت سپرلی کو اس کی محبوبہ اینےجان کی یاد برابر ستا رھی تھی۔ اور سیہیت کو بس یہی فکر کھائے جا رھی تھی کہ پانی ایک ھی برتن میں، آدھا ھی رہ گیا ھے۔

سپرلی جانے کتنی ھی بار ریگستان میں سفر کر چکا تھا۔ اسے اکثر چھوٹی چھوٹی علامتیں دیکھ‌کر ھی راستے کا تعین کرنا پڑا تھا۔ اس وقت بھی اس امید سے کہ شاید راہ دکھانےوالی کوئی نہ کوئی چیز مل جائے، وہ

جانے دو۔ اگر ہم آج یِنداق‌لی تک نہ پہنچ پائے تو راستے میں کہیں رک‌کر رات بسر کر لیں‌گے اور پو پھٹتے ہی چل‌کر تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں‌گے۔"

ڈیڑھ ہزار جانوروں کا گلہ ریت پر بہت آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ بھیڑیں بڑی مشکل سے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی تھیں۔ یہ صرف پیاس اور تھکن ہی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ آندھی کے وقت جس خوف و ہراس کا انہیں سامنا ہوا تھا اس کا بھی نتیجہ تھا۔

سپرلی اور سیہیت دونوں ہم‌عمر تھے۔ سپرلی لمبے قد کا سجیلا جوان تھا۔ اس کے سانولے کھلے ہوئے چہرے پر مونچھوں اور داڑھی کا سبزہ آ چکا تھا۔ سیہیت شکل و صورت کے اعتبار سے بھی سپرلی کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ہٹا کٹا، ذرا گول‌مٹول سا آدمی تھا اور اس کی چال بڑی بھدی تھی۔ اس کے جھائیوں‌والے چہرے پر داڑھی مونچھوں کے نام پر کہیں کہیں ملائم سے بال اگ آئے تھے۔ وہ بچپن سے ہی بہت ہی لاپروا تھا۔ اس کے جسم پر ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ بےڈھنگے طور پر لٹکتا رہتا تھا۔ کبھی کرتے کا پھٹا ہوا گریباں لٹکا ہوتا، کبھی جوتوں کے فیتے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی نیک ماں ہمیشہ کوشش کرتی تھی کہ اس کے بیٹے کے کپڑے ٹھیک ٹھاک رہیں لیکن خود سیہیت کو اپنی وضع قطع کا کچھ بھی خیال نہیں رہتا تھا۔ جہاں تک محنت مشقت کا تعلق تھا، سب کے ساتھ مل کر وہ اکیلے تین آدمیوں کا کام کر

اپنی پھیکی پھیکی روشنی برسانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند کے لطف و کرم سے ممنون ہوکر تھکا ماندا ریگستان مسکرا اٹھا ہے۔ اتنے میں کوئی گدھا زور زور سے ڈھینچو ڈھینچو کرنے لگا اور سپرلی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اٹھاکر آسمان پر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو چمکتے ہوئے تاروں کے بیچ ستارہ سحر کو فوراً پہچان‌کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ دن بھر یینداق‌لی کے کنوئیں کی طرف نہیں بلکہ دوسری مخالف سمت میں چلتے رہے تھے اور دونوں کنوؤں سے بھی دور ہٹ گئے تھے۔

سپرلی فوراً ہی یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے اس پر چاند کی روشنی نہ پڑی ہو بلکہ اس کو کسی نے نشتر مار دیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تاکہ سیہیت کی نیند میں خلل نہ پڑے اور مویشیوں کا گلہ بیچین نہ ہو، ایک ٹیلے پر چڑھا اور چاند کی روشنی میں چاروں طرف غور سے دیکھا۔ یہ مقام بالکل اجنبی تھا۔

سپرلی دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے؟ کیا سچ‌مچ اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں ہے؟ کیا زندگی سے ہاتھ دھونا ہی پڑے گا؟

لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک ایسا نوجوان جو ینگ کمیونسٹ لیگ کا ممبر ہو ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو جائے! اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آ گیا۔ ایسا لگا کہ نجات کا ایک طریقہ نکل ہی آیا ہے۔ سپرلی نے بندوق کندھے سے لٹکائی، اپنے لمبے

اونٹ پر سے اتر کر گدھے پر سوار ہو گیا اور غور سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا لیکن کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ اسے ایک بھی چیز ایسی نہ دکھائی دی جو اس بات کا ثبوت ہوتی کہ وہ لوگ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

رات کا اندھیرا آج بہت جلدی اتر آیا۔ آسمان پر بدستور گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تھکے ہارے گلےبان جانوروں کو ریت کے دو ٹیلوں کے درمیان روک کر یہیں رات بسر کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کے سچے دوست یعنی چاروں کتے بھیڑوں کے ارد گرد بیٹھ کر ان کی حفاظت کرنے لگے۔

دونوں نے اونٹوں اور گدھوں پر لدا ہوا بوجھ اتار دیا اور پھر غمگین خاموشی کے ساتھ تھوڑا سا کھانا تیار کیا۔ چائے پی چکے تو سونے لیٹ گئے۔ سیہیت تو لیٹتے ہی سو گیا لیکن آنےوالے مصائب کے تصور سے سرگرم سپرلی کو کسی طرح چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے لیٹا آسمان کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے اپنی نگاہوں سے بادلوں کے سینے چیر دینے کا تہیہ کر رکھا ہو جو چاند تاروں کو اس کی نظروں سے چھپائے ہوئے تھے۔ اسی طرح پڑے پڑے بالآخر وہ بھی سو گیا۔

...آہستہ آہستہ مطلع صاف ہونے لگا۔ ادھر ادھر بادلوں کے پردے پھٹنے اور تارے نمودار ہونے لگے۔ آدھی رات کے قریب چاند نکل آیا اور ریگزاروں پر

که اب تک اس کے ساتھی سپرلی کے دل پر اکیلے میں کیا بیتی ہوگی۔ وہ دل ھی دل میں اپنے آپ کو کوس رھا تھا کہ میں نے اتنی سستی آخر کیوں برتی اور اتنی بےفکری سے محنت اور ذمےداریوں کا زیادہ سے زیادہ بوجھ اپنے ساتھی پر کیوں ڈالتا رھا۔ اس کا جی چاھا کہ اس گناہ عظیم کی پاداش میں خود اپنے ھاتھوں اپنی جان لے لے۔

سپرلی آگے آگے چل رھا تھا۔ وہ اپنی پیاس کی آگ بجھانے کے بعد اب کافی ھشاش بشاش نظر آ رھا تھا۔ صبح کی ٹھنڈک سے اس میں دوبارہ جوش پیدا ھو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اداس خیالات سے اپنے دل و دماغ کو پوری طرح آزاد کرنے کے لئے نیچی سی آواز میں ایک شوخ سا گیت بھی چھیڑ دیا۔

لیکن جوں جوں دوپہر قریب آتی جا رھی تھی چلنا مشکل ھوتا جا رھا تھا۔ بھیڑوں کو آخری بار پانی پئے ھوئے تین دن سے زیادہ ھو چکے تھے۔ ابھی کچھ ٹھنڈک تھی اور وہ قدرے آرام سے چل رھی تھیں۔ لیکن جب گرمی بڑھ جائےگی تو ان کا کیا حال ھوگا؟ یہ کون بتا سکتا تھا؟

"میں بتا سکتا ھوں" سپرلی نے دل ھی دل میں کہا: "سب بھیڑیں مر کھپ جائیں گی۔ اور اس کی ساری ذمےداری مجھ پر عائد ھوگی" اس نے بہت اداس ھوکر سوچا۔ "پانی نہیں ھے اور اس کا مطلب یہ ھے کہ نجات کی کوئی امید نہیں ھے۔ یہ امید کرنا فضول ھے کہ اعال سے یا اپنے فارم سے کوئی مدد کے لئے آ جائےگا۔

لمبے بالوں والے تیز رفتار اونٹ پر سوار ہوا اور اپنے وفادار کتے آق بائے کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ وہ قرب و جوار کے علاقوں کا جائزہ لینے جا رہا تھا۔ اس امید سے کہ شاید کہیں کوئی کنواں مل جائے یا کم سے کم کوئی ایسا سوکھا ہوا تالاب ہی مل جائے جس میں بہار کے دنوں میں پانی جمع ہو جایا کرتا ہے۔ اس کو جلدی لوٹنے کی امید تھی اسی لئے سیہیت کو نہ جگایا۔

جب سپرلی پڑاؤ پر لوٹا تو سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ دسوں کلومیٹر کا چکر لگانے پر بھی اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا سوا اس کے کہ وہ تھک کر چور چور ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔

پانی اتنا کم رہ گیا تھا کہ وہ چائے تک نہ بنا سکے۔ جو تھوڑا سا گدلا سا پانی باقی تھا اس کو انہوں نے احتیاطاً بچا رکھا۔ بس ترکمان چرواہوں کے دستور کے مطابق ایک ایک پیالہ پگھلائی ہوئی چربی کا پی کے پھر راستے پر چل پڑے۔ اس دفعہ وہ سیدھے مغرب کی طرف چلے۔ سپرلی سے بات کرکے سیہیت نے اس بار جلد ہی تاڑ لیا کہ صورت حال اور بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ سپرلی کے منھ سے یہ سن کر کہ ہم راستے سے بھٹک گئے ہیں، اس کے دل و دماغ میں یک بیک انقلاب سا آ گیا۔ اچانک وہ سمجھ گیا کہ مویشیوں کے اتنے بڑے گلے پر جس کی خیروعافیت انہی کے ذمے ہے، کتنا شدید خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا

اس کو کوئی خاص اهمیت نه دی اور آگے چلا۔ لیکن پھر رک گیا۔ وہ لمحه بھر آق‌بائے کو غور سے دیکھتا رھا اور پھر اسی طرف کو دوڑ پڑا۔

قریب جاکر سپرلی نے دیکھا که کتا ادھر ادھر ریت کو کھود رھا ھے۔ بہت زیادہ گرمی پڑنے لگتی ھے تو کتے اکثر زمین کو کھودکر گڑھا بنا لیتے اور اس میں لیٹ جاتے ھیں کیونکه اس کی ته میں کچھ ٹھنڈک ھوتی ھے۔ یه دیکھ‌کر سپرلی کے دل میں کچھ امید سی پیدا ھوئی لیکن کوئی نتیجه اخذ کرنے میں اس نے جلدی نه کی۔ اس نے اس جگه کو غور سے دیکھا تو پته چلا که آق‌بائے نے غلطی نہیں کی تھی۔ اوپر ریت کی جو ته تھی وہ بالکل نئی تھی۔ ویسے قدرتی طور پر یه ایک مٹی‌والی نشیب تھی جہاں بہار کے دنوں میں بارش کا پانی اکٹھا ھو جایا کرتا ھے۔ لیکن اس وقت وھاں کوئی نمی نہیں تھی۔ ریت کے ڈھیروں کے سوا جو کل کی آندھی کے نشان تھے، کچھ بھی نہیں تھا۔

سپرلی نے جانوروں پر نظر دوڑائی۔ بھیڑیں اپنی زبانیں نکالے ھانپ رھی تھیں اور ڈولتی ھوئی بڑی مشکل سے پاؤں گھسیٹ رھی تھیں۔ ان کی دھندلائی ھوئی آنکھوں میں عاجزی اور اطاعت تھی۔ گدھوں کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ صرف اونٹ ھی جو "ریگستان کے جہاز" کہلاتے ھیں، جوں کے توں تھے۔ بھیڑوں کو اب آگے چلانا ناممکن تھا۔

سیہیت بھاری بھاری قدم اٹھاتا ھوا سپرلی کے پاس آیا۔ اس کی بالکل کایاپلٹ ھو گئی تھی۔ وہ سکڑ سمٹ

عشق آباد کے کسانوں نے بڑی عزت سے ہم کو رخصت کیا۔ انہوں نے ہمیں سارا ضروری سامان مہیا کر دیا۔ ہمارے فارم والوں کو تار بھی دے دیا گیا کہ ہم راستے پر نکل گئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ بےفکر ہوکر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ راستے میں اچانک آندھی آ گئی؟ انہیں کیا پتہ کہ اب ریگستان کے بیچوں بیچ ہم پر کیا بیت رہی ہے؟" سورج سر کے اوپر آ گیا۔ ریگستان تندور کی طرح تپنے لگا۔ ہوا بالکل بند ہو گئی۔ سپرلی اور سیہیت دونوں کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ سورج ساری کائنات پر روشنی پھیلانے اور گرمی پہنچانے کے بجائے اپنی ساری روشنی اور آگ ان پر اور ان کے مویشیوں پر ہی برسا رہا ہے۔

بھیڑوں کے لئے سانس لینا مشکل ہو گیا، وہ بیدم ہو گئیں۔ اب وہ چل نہیں رہی تھیں بلکہ ڈول رہی تھیں، گھسٹ رہی تھیں۔ گرنے کو ہو رہی تھیں۔ بالآخر وہ ایک ایک کرکے گرنے بھی لگیں۔ سب سے پہلے بہترین نسل کی کئی سب سے موٹی تازی بھیڑیں بیدم ہوکر گر پڑیں۔ ان کو پاؤں پر کھڑا کرنا اور سہارا دے کر آگے چلانا تھکے ماندے دو آدمیوں کے لئے اتنا ہی مشکل تھا جتنا ریت کے کسی ٹیلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا...

اچانک سیہیت کی آواز سنائی دی: "آق بائے! آق بائے!" وہ کتوں میں سے ایک کو پکار رہا تھا۔ سپرلی نے مڑکر دیکھا۔ کتا آق بائے کچھ پیچھے رہ گیا تھا اور راستے سے ہٹ کر زمین کو ادھر ادھر سونگھ رہا تھا۔ سپرلی نے

ٹھیک ہے" سپرلی نے اپنے دوست کے کندھے تھپتھپاکر اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ، کچھ باتیں کر لیں۔ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو آؤ اس طرح مریں کہ پھر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم خواہ مخواہ مر گئے۔"

سپرلی کے ان الفاظ سے بالآخر سیہیت کے احساسات دوبارہ جاگ اٹھے۔ اس کے ہوش و حواس درست ہو گئے۔

"جانوروں کو بچانے کی خاطر میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "کہو، کیا کرنا ہے؟"

"میرے دوست! ہم محض چرواہے ہی نہیں ہیں۔ ہم تو کومسومول ممبر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے آخری دم تک لڑتے رہنا لازمی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح پانی حاصل کیا جائے۔ آؤ دونوں مل کر اس جگہ ایک کنواں کھودیں۔ آخر بہار کے دنوں میں یہاں بارش کا پانی اکٹھا ہوا تھا نا۔"

سیہیت کی آنکھیں امید سے چمک اٹھیں۔

"ہاں خوب پتے کی بات کہی تم نے!" اس نے جوش سے کہا۔ "آخر عشق آباد والے بھائیوں نے ہمیں پھاوڑے اور کدالیں یونہی تھوڑی دی ہیں۔ جب تک ہمارے جسموں میں طاقت رہے گی ہم کھودتے ہی رہیں گے!"

بس پھر کیا تھا، دونوں نوجوان انتہائی مشکل کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں تقریباً بغیر پانی کے ریگستان میں کنواں کھودنے لگے۔ وہ دو

گیا تھا اور اس کا منھ جلی ہوئی لکڑی کی طرح بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔

"اب میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا، سیہیت!" سپرلی نے اس سے کہا۔ "میرے خیال میں مویشی اب نہیں بچیں گے۔ اگر تمہیں کوئی امید ہے تو بتاؤ۔"

سیہیت نے اس کے قریب آکر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اچانک پکار اٹھا: "پانی!" اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو چلا ہے۔ سپرلی نے اس کو بانہوں میں سمیٹ لیا اور بڑے پیار کے ساتھ اس سے کہنے لگا:

"ٹھیک ہے، سیہیت، میرے دوست! ٹھہرو، ہم دونوں ابھی پانی لے آئیں گے اور سب بھیڑیں بچ جائیں گی۔ بس تم ہمت نہ ہارنا، پیارے! ہمارے پاس بس یہی ایک چیز رہ گئی ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ، ذرا مشورہ کر لیں۔"

لیکن سیہیت اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ خود کو سپرلی سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر چیخنے لگا:

"ارے دیکھو۔ وہ رہا پانی۔ بالکل نزدیک ہے!"

سپرلی نے اس طرف دیکھا جس طرف سیہیت ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنا منھ موڑ لیا۔ وہاں پانی وانی کچھ نہیں تھا۔ ریگستانی سراب تھا اور بس۔

"ٹھیک ہے، سیہیت! ٹھیک ہے۔ میں کہتا ہوں،

چھلک گیا۔ چہرے کا رنگ فق پڑ گیا اور اونٹ سے گرتے گرتے بچا۔ اس کو یقین سا ھو گیا کہ اب موت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ھے۔ لیکن کومسومول ھونے کی بنا پر اس کے ضمیر کا تقاضا تھا کہ وہ واپس سیہیت کے پاس جائے اور جب تک تھوڑی سی بھی طاقت رھے، شروع کئے ھوئے کام کو جاری رکھے۔

اس نے قوت‌ارادی سے اپنے جھکے ھوئے سر کو اٹھایا اور اپنے اونٹ کی لگام ھلائی۔ اسی وقت دفعتاً کوئی بہت ھلکی سی گڑگڑاھٹ سن‌کر وہ چونک پڑا۔ یہ ھوائی جہاز تو نہیں ھے؟ اس خیال کے آتے ھی وہ ایک بار پھر اپنا توازن کھو بیٹھا۔ لیکن اس بار رنج و غم سے نہیں، وفور مسرت سے۔ ھوائی جہاز لمحہ بہ‌لمحہ قریب آ رھا تھا۔ ایسا معلوم ھوتا تھا کہ ھواباز اپنی کسی منزل کی طرف نہیں جا رھا ھے بلکہ کسی کو تلاش کر رھا ھے۔ دراصل یہ ھوائی جہاز تھا جو کسی طرف کو سیدھا نہیں اڑ رھا تھا۔ وہ کبھی اس طرف مڑتا تھا، کبھی اس طرف اور کبھی دائرے بناتا تھا۔ ھواباز کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے سپرلی اپنے اونٹ پر کھڑا ھو گیا اور اپنے چوغے کو اتارکر اور اونچا اٹھاکر زور زور سے ھلانے لگا۔

اسے ایسا لگا کہ اب مایوسیوں کا سلسلہ ختم ھو گیا ھے۔ ھواباز نے غالباً نوجوان کو دیکھ لیا اور ھوائی جہاز اپنے بازوؤں کو ھلاتا ھوا سپرلی کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ کچھ دور جاکر وہ پیچھے مڑا اور نیچے آکر

گھنٹے تک پسینے میں شرابور مشین کی طرح کام کرتے رھے۔ پیاس سے دم توڑتی ھوئی بھیڑوں پر ایک نظر ڈال لینا کافی ھوتا تھا اور ان میں دوگنی طاقت آ جاتی تھی۔ دونوں دوست کھودتے رھے، کھودتے رھے...

ان کے پاس جو تھوڑا سا پانی تھا وہ ختم ھو گیا۔ لیکن پھر بھی وہ رکے بغیر جی جان سے کام میں لگے رھے۔ دونوں ھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اب اس طرح زیادہ دیر تک کام نہیں چلےگا، اب ان کی طاقت جواب دینےوالی ھے۔ لیکن یہ بات ان کی زبان پر نہیں آئی تھی۔ اچانک سپرلی کام کرتے کرتے رک گیا اور اس نے سیہیت سے کہا:

"سنو۔ مجھے ایک اچھی سی بات سوجھی ھے۔ نہ جانے یہ خیال مجھے اس سے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ تم کام کرتے رھو یا پھر تھوڑی دیر آرام ھی کر لو۔ اور میں اونٹ پر چڑھکر یینداق‌لی ھو آؤں۔ کنوئیں سے دو برتنوں میں پانی بھر لاؤں‌گا۔ اس کے سہارے ھم یہ کنواں کھود ھی لیں‌گے۔"

سیہیت خوشی خوشی راضی ھو گیا۔ اس کو سپرلی پر پورا پورا بھروسہ تھا۔

سپرلی اپنے اونٹ پر سوار ھوکر کوئی دو گھنٹوں کے اندر اندر کافی آرام سے یینداق‌لی کے کنوئیں پر پہنچ گیا۔ لیکن وھاں بھی مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا۔ کل‌والی آندھی نے وھاں بھی قیامت ڈھائی تھی۔ کنواں اوپر تک ریت سے بھر گیا تھا...

یہ منظر دیکھ‌کر سپرلی جیسے آدمی کا بھی پیمانہ صبر

آپ لوگوں کو" ھواباز نے کہا۔ "جس دن آپ کا تار ان کو ملا تھا اسی دن سے وہ روز ھوائی‌اڈے میں فون کرکے ھم سے پوچھتے تھے کہ ھوابازوں نے آتے جاتے اپنے ھوائی جہاز سے آپ لوگوں کے گلے کو دیکھا ھے کہ نہیں۔ پہلے تو کئی دنوں تک ھمارے ھواباز آپ لوگوں کو برابر دیکھتے رھے اور پرسوں جب آندھی آئی تو اس کے بعد آپ لوگ ایک طرف کو مڑ گئے۔ اس کی اطلاع ھم نے فارم‌والوں کو دے دی۔ تب پھر فارم سے ایک لڑکی ھمارے ھاں آئی۔ بڑی خوبصورت اور بہت ھی دھن کی پکی تھی وہ۔ فارم کے چیرمین نے کہلا بھیجا تھا کہ کسی ھوائی جہاز کو بھیج‌کر آپ لوگوں کو تلاش کیا جائے تو اچھا ھو۔ ھم نے کہا کہ ایک دو دن ٹھہرنا ھوگا۔ لیکن لڑکی نہ مانی، اصرار کرتی رھی۔ آخر ھمارے سربراہ نے لاچار ھوکر مجھ کو بھیج دیا۔ اور میں نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر آپ لوگوں کو ڈھونڈ ھی لیا۔"

سپرلی فوراً ھی سمجھ گیا کہ ھواباز جس لڑکی کی بات کر رھا ھے وہ اینے‌جان ھی ھے، کوئی دوسری نہیں ھو سکتی۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے دل کی دنیا میں بہار آ گئی۔ وہ دفعتاً اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کرنے لگا کہ اینے‌جان اور اپنے درمیان حائل طویل راستے کو پیدل ھی طے کر سکتا تھا۔ ھواباز کو تو یہ سب باتیں معلوم نہیں تھیں لیکن وہ دیکھ رھا تھا کہ سپرلی ان لوگوں میں سے نہیں ھے جو ھوش و حواس کھو دیتے ھیں۔ لگتا تھا کہ ساتھی

اترنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن سپرلی اپنے چوغے کو بدستور ہلاتا رہا اور مشرق کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ہواباز اس کے اشارے کو یقیناً سمجھ گیا اور ہوائی جہاز پھر دوبارہ اونچا اٹھکر اس طرف روانہ ہو گیا جہاں ان لوگوں کے مویشی دم توڑ رہے تھے۔

سپرلی خوشی سے پھولا نہ سمایا اور واپس چل پڑا۔ اونٹ نے بڑی سرعت سے چلتے ہوئے اس کو ایک ہی گھنٹے میں منزل تک پہنچا دیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ دیکھا کہ ایک ہوائی جہاز ریت کے میدان میں کھڑا ہے، اس کے ایک بازو کے نیچے سایہ میں ہواباز ایک رومال کو بھگوکر سیہیت کی پیشانی پر لگا رہا ہے۔ سپرلی کو آتے دیکھکر ہواباز اٹھکے اس کی طرف چلا۔ اس نے اچھا ہی کیا کیونکہ اس وقت سپرلی نہ کچھ دیکھ پا رہا تھا اور نہ ہی اسے کسی شے کا احساس تھا۔ وہ اونٹ پر سے اترا نہیں، بلکہ گر پڑا۔ ہواباز نے اس کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور لے جاکر سیہیت کے پاس لٹا دیا۔

سپرلی کو ہوش آیا تو اس نے اپنے نجات‌دہندے کا ہاتھ زور سے بھینچ‌کر اس سے کہا:

"میرے بھائی! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں! آپ خوب وقت پر پہنچے اور ہماری جانیں بچا لیں۔ اب تو ہم مویشیوں کو موت کے چنگل سے بچا ہی لیں گے۔"

"ارے آپ میرا شکریہ کیوں ادا کرتے ہیں۔ شکریہ اپنے فارم‌والوں کا ادا کیجئے۔ انہوں نے ہی بچایا ہے

نتھنوں کو پانی سے بھگو ھی رھا تھا کہ پانی کی بو پاکر بہت سی دوسری بھیڑیں بھی اٹھ اٹھکر آ گئیں اور برتن پر ٹوٹ پڑیں۔ برتن سیہیت کے ھاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا سارا پانی بہہ گیا۔

اس سے دونوں نوجوانوں کو رنج تو بہت ھوا لیکن مایوس ھونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد بہت زیادہ وقت نہیں گزرنے پایا کہ دفعتاً کسی ھوائی جہاز کی گڑگڑاھٹ سنائی دی۔ ایک ھی منٹ بعد ایک بڑا سا ھوائی جہاز ریت کے میدان میں آکر اترا۔ اس میں اجتماعی فارم کے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ پھاوڑے، کدالیں ھی نہیں زمین برما کرنے کی ایک مشین بھی لےکر آئے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ آتے ھی کنواں کھودنے میں لگ گئے۔

آگے جو کچھ ھوا وہ مختصر انداز میں بیان کیا جا سکتا ھے۔ راتوں رات کنواں تیار ھو گیا۔ فارم کی زندہ دولت یعنی ڈیڑھ ھزار بھیڑیں بچا لی گئیں۔ ان کو منزل تک پہنچانے کا کام کچھ دوسرے لوگوں کے سپرد کرکے فارم کا چیرمین سپرلی اور سیہیت کو اسی ھوائی جہاز میں بٹھاکر اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ فارم‌والوں نے ان نوجوانوں کا جو ریگستان کے خلاف اپنی جد و جہد میں جیت گئے تھے، کیسی گرم‌جوشی سے استقبال کیا ھوگا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں ھے۔

لیکن مزے کی بات یہ ھے کہ یہ دونوں نوجوان کامیابی کا سہرا اکیلے اپنے سر لینے کو تیار نہ ھوئے۔

بھی اس کے لئے بہت مناسب ھے۔ پانی پی‌کر اور تھوڑی دیر آرام کرکے جب طاقت کچھ بحال ھو گئی تو دونوں کومسومول ممبر نوجوان اٹھے اور گلے کو دیکھنے چلے۔ مویشیوں کی جان پر بنی ھوئی تھی۔ یہ دیکھ‌کر ھواباز نے کہا کہ وہ ابھی مدد لانے کے لئے چلا جائےگا اور سپرلی سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن اس نے قطعی انکار کر دیا۔ سپرلی نے کہا کہ مَویشی اس کے سپرد کئے گئے ھیں اور وہ ان کو اس حالت میں چھوڑکر کہیں نہیں جا سکتا۔ سیہیت نے بھی یہی کہا۔ آخر ھواباز چلا گیا۔ دونوں دوست تپتے ریگستان میں آنےوالی مدد کا انتظار کرنے لگے۔ وقت بہت آھستہ گزر رھا تھا۔ جانوروں کی حالت کو دیکھ‌کر سپرلی اور سیہیت بہت کڑھ رھے تھے۔ خاص طور پر سیہیت کا دل خون ھوا جاتا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ‌کر سپرلی سے نہ رھا گیا۔ اس نے سیہیت سے کہا:

"سنو، سیہیت! ھواباز تو ھمارے لئے تین لیٹر پانی چھوڑ گیا ھے۔ ھوائی جہاز جلد ھی مدد لےکر آ جائےگا۔ سو ھمارے پینے کے لئے ایک لیٹر پانی کافی ھوگا۔ آؤ باقی دو لیٹر پانی کو ان بھیڑوں کو پلا دیں جن کی حالت سب سے زیادہ خراب ھے۔ کم سے کم ان کے منھ ھی نم ھو جائیں۔"

سیہیت پانی کے برتن کو اٹھاکر مارے کمزوری کے لڑکھڑاتا ھوا اعلا نسل کے ایک دنبے کے پاس گیا جس کی حالت بہت ھی خراب تھی۔ وہ اس کے سوجھے

بیردی نظر خدائے نظروف



قراقم کے آسمان تلے

(ناولٹ کے کچھ ٹکڑے)

قاراباش یمودووچ عشق آباد سے واپس آ گئے، تھکے ماندے اور جھلائے ہوئے۔ یه سفر بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔ قاراباش یمودووچ کہا کرتے ہیں که میں نه قراقم کی چلچلاتی دھوپ سے ڈرتا ہوں اور نه ہی سرسراتی سفید ریت سے۔ ڈرتا ہوں تو بس اسٹیشنوں کے شور و غل اور بھاگ دوڑ سے۔ یہی مجھے کسی نه کسی دن قبر میں پہنچا دے گی۔ ہاں بات ہی کچھ ایسی ہے۔ عشق آباد پہنچنے کے لئے آپ کو سب سے پہلے کیرکی جانا ہوگا۔ وہاں سے اسٹیمر آپ کو دریا پار پہنچا دے گا۔ وہاں سے آپ اپنی اٹیچی کو اٹھائے اٹھائے پاپیادہ ریلوے اسٹیشن کی راہ لیں گے۔ اسٹیشن پہنچ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگیں گے...

"کاش سیدھی عشق آباد جانے والی کوئی پکی سڑک ہوتی! موٹر میں بیٹھ کر چند ہی گھنٹوں میں عشق آباد پہنچ جایا کرتے!" قاراباش یمودووچ کہتے تھے۔

اینےجان کامیابی کے لئے ان دونوں کو مبارکباد دینے لگی تو سپرلی نے کہا:

"اس جد و جہد میں جو جیت ہوئی ہے وہ صرف ہم دونوں ہی کی تھوڑی ہے۔ کیا اس کامیابی کا سہرا ہواباز ایوانوف کے سر بھی نہیں ہے جو اس آڑے وقت میں ہماری مدد کو پہنچے؟ کیا یہ کامیابی ان لوگوں کی بھی نہیں ہے جنہوں نے راتوں رات ایک کنواں کھود لیا؟ اس کامیابی کو ممکن بنانےوالے وہ کمیونسٹ لوگ بھی تو ہیں جنہوں نے ہماری تلاش میں ریگستان میں ہوائی جہاز بھیج دیا۔ ریگستان کو جیتنے کا سہرا ہم سب لوگوں کے سر ہے، یہ ہماری پوری سوویت قوم کی جیت ہے۔"

چکیں اور قاز کی طرح چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔
قاراباش یمودووچ کچھ دیر تک اسی طرح سر جھکائے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر دودھ جیسے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا اور میری طرف بڑھے۔

"کہو بھئی سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" انہوں نے قریب آکر پوچھا اور پہیے کو ٹھوکر مارکر دیکھا کہ غبارے میں خوب ہوا بھری ہے کہ نہیں۔

"جی ہاں سب ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔ پھر کہا: "اب اس ہڈ کو بدلنا چاہئے، قاراباش یمودووچ۔ یا پھر اس کو سرے سے اتار ہی پھینکنا چاہئے!"

سربراہ مسکرا دئے اور کہا:

"مجھے بھی یہ خیال آ چکا ہے۔ ہاں ابکے عشق‌آباد جاتے ہوئے میں اس کو اپنے کیرکی مرکز میں چھوڑ گیا تھا۔ مرکزوالوں نے بھی مجھ سے کہا کہ اس پر دوسرا ہڈ لگوا دیا جائے۔ میں نے دیکھا تو اپنا ہڈ بھی کچھ برا نہ معلوم ہوا۔ بس رنگ کچھ اڑ گیا ہے اس کا۔ تم نے اپنی گیرج تھوڑی سی بڑی کیوں نہیں بنائی؟ ٹیم کی دونوں موٹریں وہاں رکھی جا سکتی تھیں..."

"ارے سربراہ، آپ بھی کیا بات کرتے ہیں! کیا ہم "گازیک" کے لئے ایک الگ گیرج نہیں بنا سکتے؟"

"کوئی ضرورت نہیں" انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ انہوں نے اپنا پاؤں اس طرح پہیے پر رکھا جیسے اپنا فل بوٹ صاف کرنا چاہتے ہوں اور پوچھا: "تم لوگوں

قاراباش یمودووچ جب کاروباری سفر سے لوٹے تو چھٹی کا دن تھا اور سب لوگ اپنے اپنے خیمے میں آرام کر رہے تھے۔ سب سے پہلے توتی جپاروونا سربراہ سے ملنے ان کے خیمے میں گئیں۔ وہ بہت دیر تک وہاں رہیں۔ میں باہر خیمے سے کچھ ہٹ کر کھڑا "گازیک" کے بد رنگ ہڈ کو دیکھتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ پھرتیلی، طاقتور اور مضبوط کار ٹیم کے سربراہ کے لئے کس قدر موزوں ہے! اتنی ہی موزوں ہے جتنا ٹیم کی ناظم کار توتی جپاروونا کے لئے ان کا گھوڑا۔

جب کبھی فرصت ملتی میں بیکاری سے اکتاکر "گازیک" کی دیکھ بھال یعنی اس کے امراض کی روک تھام میں لگ جاتا۔ ویسے تو اس کام کو پوری طرح خود سربراہ نے سنبھال رکھا تھا، خود ہی چلاتے اور خود ہی مرمت کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مجھے ہدایت نہیں کی تھی کہ میری کار کی دیکھ بھال کرو۔ دراصل ہمارے سربراہ قاراباش یمودووچ دوسرے سربراہوں سے بالکل مختلف تھے!

ٹیم کے سربراہ قاراباش یمودووچ اور ناظم کار توتی جپاروونا دونوں ساتھ ساتھ خیمے سے باہر نکل کر کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔ توتی جپاروونا بڑے جوش و خروش سے کچھ سمجھا رہی تھیں اور قاراباش یمودووچ سر جھکائے کھڑے سن رہے تھے۔ میں فوراً بھانپ گیا کہ بات کیا ہے۔

بالآخر توتی جپاروونا کو جو کچھ کہنا تھا کہہ

جواب دیا۔ "دوسروں کا جی لگ گیا ہے تو میرا بھی لگ ہی جائےگا۔ شہر کی رہنےوالی ضرور ہوں لیکن نازک تھوڑی ہوں۔"

"خوب۔ بہت خوب" سربراہ نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ قراقم تو نہ نازک مزاجوں کے لئے ٹھیک ہے اور نہ ہی سرکشوں کے لئے۔"

یہ کہہ‌کر انہوں نے آلماگل پر ایک نظر ڈالی اور اپنی قمیض کی جیب سے بڑے بڑے شیشوں‌والی اپنی عینک نکال‌کر لگا لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب کام کی بات کرنے جا رہے ہیں۔

"آپ کا اپنا نام تو آلماگل ہے" انہوں نے عینک میں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اور آپ کا خاندانی نام کیا ہے؟"

"اسلانووا" جواب ملا۔

"ٹھیک ہے، کامریڈ اسلانووا۔ ٹھیک ہے۔ آپ مجھے معاف کیجئے، میں آپ سے ایک بات صاف صاف دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خیال میں کیا ہماری مہم کا کام غلط راستے پر چل رہا ہے؟"

آلماگل اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے کچھ دیر تک چپ رہی۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا:

"قاراباش یموودووچ! دیکھئے نا... جب میں یہاں آ رہی تھی تو مجھے یہاں بالکل دوسرے حالات دیکھنے کی امید تھی۔ ظاہر ہے کہ قطعی طور پر کچھ کہنا تو میرے لئے آسان نہیں ہے۔ میں بس ایک طالبہ ہوں۔ عملی کام کی ابھی تربیت ہی حاصل کر رہی ہوں۔ لیکن

کا یہاں کیا حال ہے؟ ہمارے یہاں عملی تربیت کے لئے جو لڑکی آئی ہے اسے تنگ تو نہیں کر رہے ہو؟"

"اس لڑکی کو؟ میرے خیال سے اسے تنگ کرنے کی نوبت نہیں آئی" میں نے جواب دیا۔ "ویسے اس کو تنگ کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ وہ کوئی بھیگی بلی سی لڑکی تھوڑی ہے۔"

"اچھا! یہ تو اچھی بات ہے۔ بہت ہی اچھی بات ہے" انہوں نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے: "ہم سب ایک دفعہ مل کے بیٹھیں، اس سے ہماری اچھی طرح جان پہچان ہو جائے تو اچھا ہو۔ آج ہی یا پھر کل... لیکن پہلے ضروری ہے کہ میں اکیلے ہی اس سے مل کر بات کر لوں" یہ کہتے ہوئے انہوں نے معنی‌خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا:

"وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ تو جاؤ تم اس کو بلا لاؤ!"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ آلماگل بڑی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک چنچل مسکراہٹ کے ساتھ سربراہ سے علیک سلیک کی۔ وہ بھی ادب اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مسکرا دئے اور اس کی مزاج‌پرسی کرنے لگے۔

"تو دھیرے دھیرے جی لگ رہا ہے نا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں، جی لگ رہا ہے۔ اور کیا؟" اس نے

"سارے کام کی نگرانی توتی جپاروونا کر رهی هیں" آلماگل کہتی گئی۔ "اس لئے میری نکتہ‌چینی کا رخ شاید انهی کی طرف هوگا..."

"یه تو ظاهر هے" قاراباش یمودووچ نے لڑکی کو ٹوک‌کر کہا۔ "لیکن کامریڈ اسلانووا، آپ نے، خود آپ نے کون سا ایسا کام کیا هے جس کی بنا پر آپ کو ایسی باتیں کرنے کا حق پهنچتا هو؟"

"میں تو کچھ بهی نهیں کر پائی هوں، قاراباش یمودووچ۔ کچھ بهی نهیں۔ میرے یہاں رهنے کا ابهی کوئی عملی نتیجه سامنے نهیں آیا هے۔ میرے کچھ مشاهدات هیں اور بس۔"

"کچھ نتائج اخذ کئے هوں‌گے شاید؟" سربراه نے ذرا طنزیه لهجے میں کہا۔

"نتیجے اخذ کرنے میں تو خیر ابهی دیر لگےگی لیکن هاں کچھ خیالات میرے ذهن کے پردے پر ابهر ضرور آئے هیں" لڑکی نے سربراه کے طنز کی کچھ پروا کئے بغیر سیدهے سادے انداز میں کہا۔

قاراباش یمودووچ کی گفتگو کا انداز اچانک بدل گیا۔

"خیالات؟ کون سے خیالات؟" انهوں نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا اور نه جانے کیوں مجھ پر ایک نظر ڈال لی۔ آلماگل نے کہا:

"میرے خیال میں نهر کو نشیب سے نکالنا یعنی دریا کا جو پرانا پاٹ هے اس پر نکالنا بالکل لازمی نهیں هے۔ دوسرے راستے بهی هو سکتے هیں۔ کم از کم یه

پھر بھی مجھے ایسا لگتا ھے کہ تحقیقی کام جس ڈھنگ سے کیا جانا چاھئے اس سے نہیں کیا جا رھا ھے..."

قاراباش یمودووچ نے کھانس کر گلا صاف کیا، اپنی عینک ٹھیک کی اور پھر کہا:

"ھوں... میں چاھوں گا کہ آپ ذرا صاف صاف بتائیں۔ ھاں یہ خیال ضرور رکھئے کہ ھماری یہ ٹیم کوئی بڑی اور ھمہ‌پہلو ٹیم نہیں ھے۔ یہ تو تحقیق و تفتیش کا کام کرنے والے بہت سے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں سے ایک ھے۔"

"یہ تو میں سمجھتی ھوں۔ لیکن ایک دوسری بات میری سمجھ میں نہیں آتی اور وہ یہ کہ ھمارے ھاں کھوج کا کام سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے اتنی پست سطح پر کیوں چل رھا ھے۔ ھمارے ھاں تجربہ‌گاہ تک نہیں ھے۔ نمونے ھاتھ سے لئے جاتے ھیں اور تجزیے کے لئے تھیلیوں میں عشق‌آباد بھیجے جاتے ھیں۔ ایسا لگتا ھے جیسے ھم تجزیے کے لئے نمونے نہیں بلکہ شادی کے پکوان بھیج رھے ھوں... ھم تو اس علاقے کا جائزہ لے رھے ھیں جہاں سے نہر نکلنی ھے۔ ھم جو معلومات فراھم کریں گے انھی کی بنا پر نہر کا تکنیکی ڈھانچہ تیار کیا جائے گا۔ تو پھر ھم کیسے یہ گوارہ کر سکتے ھیں کہ تحقیقی کام... مجھے تو موزوں لفظ ھی نہیں مل رھا ھے۔ تحقیقی کام کا معیار اتنا گیا گزرا ھو؟.."

"ٹھیک ھے، ٹھیک ھے۔ کہئے کہئے" قاراباش یمودووچ نے کہا اور انھوں نے کسی ضرورت کے بغیر دوبارہ اپنی عینک کو ٹھیک کیا۔

ایک نئے دور کا آغاز ہوگا یا یوں سمجھئے کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے (یہ زیادہ‌تر ہمیں پر منحصر ہے)۔ چنانچہ ہم ماضی کی سائنسی ترقی سے چمٹے نہیں رہ سکتے۔ اس کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ اور توتی جپاروونا ہیں کہ بالکل فرسودہ، بالکل گئے گزرے خیالات کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ ہم تو سراغ رساں ہیں۔ جو کام ہم انجام دیں گے، جو معلومات ہم فراہم کریں گے انہی پر حملے کی کامیابی منحصر ہوگی، جو عظیم کام ہم نے ہاتھ میں لیا اس کی تکمیل منحصر ہوگی۔ اور توتی جپاروونا پرانے طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ بےشک یہ طریقے زیادہ آرام‌دہ ہیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"بس کافی ہے، آلماگل" قاراباش یمودووچ نے لڑکی کو ٹوک دیا۔ "کسی کو قصوروار ٹھہرانے کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، قاراباش یمودووچ؟" آلماگل ناراض ہو گئی اور اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "میں کیوں کسی پر الزام لگاؤں؟ یہ کوئی عدالت تو ہے نہیں۔ بس میں نے سوچا کہ نیا آدمی۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی اور اپنا منہ موڑ لیا۔

میں سربراہ سے چیخ‌کر یہ کہنے کے لئے تڑپ اٹھا کہ آلماگل ٹھیک ہی کہتی ہے، وہ ہماری بھلائی چاھتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آلماگل بہت ہی شاندار لڑکی ہے!۔۔

"دیکھئے نا آلماگل" قاراباش یمودووچ نے قمیض کے

طے ھے کہ اس راستے کو پوری طرح اطمینان‌بخش نہیں کہا جا سکتا۔ آج جب کہ تکنیک اتنی ترقی کر چکی ھے، کسی نہر کے راستے کا انتخاب کرتے وقت زمین کی ساخت ھی کو مد نظر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس سے بھی زیادہ اہم باتیں ھیں۔ چنانچہ ضروری ھے کہ ھماری ٹیم اپنا کام انجام دینے کے سلسلے میں نہر کے لئے پہلے سے طےشدہ راستے ھی سے چمٹی نہ رھے بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ دوسرے راستے بھی ھو سکتے ھیں، ایسے راستے جو ممکن ھے طےشدہ راستے سے زیادہ منفعت‌بخش ھوں۔۔۔"

قاراباش یمودووچ نے ایک جھٹکے سے اپنی عینک اتار لی۔

"ھوں۔ ھاں ھاں، اپنی بات جاری رکھئے۔ میں سن رھا ھوں" انہوں نے کہا۔ لڑکی کہتی گئی:

"ھو سکتا ھے، میری باتیں آپ کو سیدھی سادی اور بےبنیاد معلوم ھوں اور آپ ان کو ایسی نادان بچی کے الفاظ تصور کریں جسے اپنی ذات پر خواہ مخواہ غرور ھو گیا ھے۔ لیکن جو کچھ میں سوچتی ھوں وہ کہہ دوں گی۔"

"ھاں ھاں ضرور کہئے، آلماگل۔ میں سن رھا ھوں۔ بڑے غور سے سن رھا ھوں" سربراہ نے کہا۔ لڑکی نے اظہار خیال کا سلسلہ جاری رکھا:

"اس وقت ھمیں سب سے زیادہ جس بات کو مد نظر رکھنا چاھئے وہ یہ ھے کہ اس نہر کی تعمیر سے ھائیڈروٹیکنکل پروجیکٹوں کی تعمیر کے سلسلے میں

خاصی معمر ہو چکی ہیں اور صحت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے..."

آلماگل نے چپ چاپ سر ہلاکر خامی بھری۔ قاراباش یمودووچ نے نظر اٹھاکر اس کی طرف دیکھا، کچھ کہنے کو ہوئے، لیکن نہیں کہا۔ بس اپنی عینک اتارکر جیب میں ڈال لی۔

چھٹی کا دن ہم میں سے ہر ایک اپنے طور پر گزارتا ہے۔ توتی جپاروونا اس دن اپنے خیمے سے باہر نہیں نکلتیں۔ کم از کم آج تو وہ نکلنے سے رہیں۔ وہ اس وقت شاید لکھنے یا پڑھنے میں مصروف ہوں‌گی یا ممکن ہے سو رہی ہوں۔ قاراباش یمودووچ اب اپنے خیمے میں جاکر کافی بناکر پئیں‌گے اور پھر اپنے متعدد دوستوں اور واقفکاروں کے نام خطوط لکھنے بیٹھیں‌گے۔ ٹیوب ویل کھودنےوالے صبح ہی سے غائب ہیں، غالباً شکار کھیلنے گئے ہیں۔ ریڈیوآپریٹر اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور میں؟ جب آلماگل نہیں آئی تھی تو میں اس دن عموماً مکھیاں مارتا پھرتا تھا۔ کبھی کبھار پڑوسی چرواہوں کے ہاں چلا جاتا تھا۔ آج کے لئے تو میں نے ایک خاص پروگرام بنا رکھا تھا۔ آج مجھے آلماگل کو لے جاکر پرانے ذخیرۂ آب کی سیر کرانے کا ارادہ تھا۔ لیکن صورت حال اچانک بدل گئی ہے۔ یہ منصوبہ اب خاک میں مل چکا ہے۔ توتی جپاروونا اور آلماگل کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم دونوں سیر کرنے گئے تو ممکن ہے کہ لوگ الٹی سیدھی باتیں اڑانے لگیں۔ اس لئے اب

دامن سے اپنی عینک کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری ٹیم تکنیکی وسائل سے زیادہ لیس نہیں ہے۔ ہمارے پاس اپنی ایک الگ تجربہ‌گاہ موجود نہیں ہے، جس قسم کی برما مشین ہمیں چاہئے وہ نہیں ہے، مزدور نہیں ہیں..."

"آخر یہ سب کیوں نہیں ہے؟" آلماگل نے متعجب نظروں سے ان کی طرف دیکھ‌کر پوچھا۔

"واہ کیسی بچوں جیسی معصومیت کا سوال ہے! اس لئے نہیں ہے کہ اخراجات کی فہرست پر ابھی مہر تصدیق ثبت نہیں ہوئی۔ اس لئے نہیں ہے کہ محکمۂ مالیات سستی کر رہا ہے! محکمۂ مالیات کے نمائندے ہمارے صلاح مشورے کے جلسوں تک میں شریک نہیں ہوتے۔"

"تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری باتیں اتنی بیجا نہیں ہیں؟"

"جی ہاں، آلماگل آپ کا خیال درست ہے۔ بالکل درست! لیکن آپ یہ تصور نہیں کر سکتیں کہ کسی اچھے خیال کے پیدا ہونے اور اس کے عملی شکل اختیار کرنے کے درمیان کتنا طویل فاصلہ حائل ہوتا ہے! خیر کچھ بھی ہو، مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہماری ٹیم میں ایک جوشیلے اور سچے دل سے کام کرنےوالے رکن کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن آپ سے بس ایک گزارش ہے: آپ تیزی نہ دکھائیے۔ موڑ سے گزرتے ہوئے ذرا احتیاط سے کام لیجئے۔ یہ نہ بھولئےگا کہ توتی جپاروونا نے اپنے شعبے میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ

جان بوجھکر خود کو اذیت پہنچا رہی تھیں تاکہ لوگ یہ نہ سوچیں کہ بوڑھی اور موٹی ھیں اس لئے تھک گئی ھیں... خیر، پسند اپنی اپنی۔

میں نے قریب جاکر زیادہ سے زیادہ پیار بھرے لہجے میں کہا:

"گیلینجے*، آداب!"

انہوں نے بہت آھستہ سے نظر اٹھاکر میری طرف دیکھا اور پوچھا:

"یہ میں تمھاری رشتےدار کب سے بن گئی؟"

میں یہ جانتا تھا کہ وہ ھنسی مذاق نہیں سمجھتی تھیں اس لئے میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا:

"جب آپ کے ھیٹ کو ھوا اڑا لے گئی تھی اور میں اسے اٹھا کر لایا تھا تو آپ مجھے بیٹا کہنے کو بھی تیار ھو گئی تھیں۔کیا اب میں دیور بننے کے بھی لائق نہیں رھا؟"

"بڑے بےادب ھیں آپ" انہوں نے خشمگیں نگاھوں سے دیکھتے ھوئے کہا۔ "قصور میرا ھی ھے۔ میں نے ڈھیلا چھوڑ دیا ھے۔ اپنے سے بڑوں کا کچھ بھی ادب و لحاظ نہیں کرتے۔ جب میں نے کنڈیڈیٹ کی ڈگری حاصل کی تو یہ اپنا نام تک نہیں لکھ پاتے تھے۔ اور اب بڑے عقل‌مند ھو گئے ھیں۔ چھوٹے ھیں، مگر بڑوں کے کان کاٹتے ھیں!"

میں خوب جانتا تھا کہ ان کے تیر کا نشانہ اصل

---

* بھابی۔

سیر کے لئے سب کو بلانا ہوگا۔ جائیں نہ جائیں ان کی مرضی۔ کوئی نہ تیار ہوا تو ہم دونوں ہی چلے جائیں گے۔ میرا ضمیر مطمئن رہےگا کہ میں نے سب کو بلایا تھا۔

قاراباش یموودووچ اپنے خیمے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ان کو پکارا اور کہا:

"قاراباش یموودووچ! مجھے ایک تجویز سوجھی ہے۔ کیوں نا ہم لوگ ساتھ ساتھ نہر کی سیر کر آئیں؟"

انہوں نے تعجب سے میری طرف دیکھا، زیر لب مسکرائے اور کہا:

"مجھے یہ علم ہی نہیں تھا کہ تم میں بھی ایسی قابلیت ہے یعنی انتظام و اہتمام کی قابلیت۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میرا بھی بہت جی چاہتا ہے کہ اس ترقی‌پسند اقدام کو لبیک کہوں لیکن کیا کروں، اس دوڑ دھوپ سے بہت تھک گیا ہوں... تم لوگ میرے بغیر چلے جاؤ۔"

"خیر یوں ہی سہی۔ میں یہ تجویز جاکے توتی جپاروونا کے سامنے رکھوں گا۔"

میں توتی جپاروونا کے خیمے کی طرف چلا۔ پتہ چلا کہ توتی جپاروونا خیمے کے اندر نہیں ہیں۔ وہ خیمے کے پیچھے سائے میں بیٹھی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ان کے جسم کے بوجھ سے کرسی کے پایے سارے کے سارے ریت میں دھنس گئے تھے۔ ریت پر کچھ بچھاکر لیٹ جاتیں تو کہیں بہتر ہوتا۔ لیکن وہ کب ایسا کرنےوالی تھیں! وہ تو کرسی پر بیٹھ‌کر

6—3078

ھیں، گھنٹیوں کی جھنجھناھٹ کانوں میں گونجنے لگتی ھے اور چرواھوں کے ھاں جانے کی خواھش جاگ اٹھتی ھے۔ بےشک چرواھے وہ لوگ ھیں جنھوں نے ریگستان پر سچ مچ ھی قابو پایا ھے۔ مجھے ان لوگوں سے بڑی محبت ھے۔ وہ بڑے کم‌گو، صبر و تحمل‌والے اور مہمان‌نواز ھوتے ھیں۔ وہ کسی سلسلے میں کوئی کچی پکی رائے بنانے کی جلدی نہیں کرتے لیکن جو کچھ وہ جانتے ھیں وہ پکا ھی ھوتا ھے۔ چرواھوں سے اتنی محبت ھوتے ھوئے بھی میں نے پچھلے کچھ دنوں سے ان سے ملنا جلنا بند کر دیا ھے۔ بےشک وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملتے ھیں، چائے پلاتے ھیں، مزاج‌پرسی کرتے ھیں لیکن جونہی تحقیقی ٹیم کا ذکر چھیڑتا ھوں وہ منھ پھیرکر چپ سادھ لیتے ھیں۔ کبھی کبھی تو طنزاً زیرلب مسکرا بھی دیتے ھیں۔

اس قسم کی ٹیموں پر انھیں بالکل اعتماد نہیں ھے۔ وہ ان لوگوں کو بہت دیکھ چکے ھیں جو سر پر "پھوس کی ٹوکریاں" لگائے اور ھاتھ میں دھاری‌دار ڈنڈے لئے ادھر ادھر پھرتے ھیں! وہ کچھ دن گھوم پھرکر ادھر ادھر زمین کو کھودتے ھیں اور پھر اپنے لمبے لمبے ڈنڈے گاڑیوں پر لادکر واپس چلے جاتے ھیں۔ اور ریگستان جوں کا توں پڑا رہ جاتا ھے۔ نہ پانی، نہ تیل...

سچ پوچھئے تو آلماگل کی باتیں سن‌کر میں بھی کچھ مایوس سا ھو گیا ھوں۔ پتہ چلا کہ ھم وہ نہیں کر رھے ھیں جو کہ ھمیں کرنا چاھئے۔ یوں سمجھئے کہ

میں میں نہیں ہوں۔ لیکن یہ مجھے اور بھی برا لگا۔ میں نے بھی ویسا ہی جواب دیا:

"بندھا رہےگا تو تیز سے تیز گھوڑا بھی اپنی صفات کھو بیٹھےگا۔ بیس سال تک ایک ہی جگہ کھڑا رہا ہو تو اس سے امید ہی کیا ہو سکتی ہے؟"

ان کے منھ پر ایسے سخت الفاظ کہنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اتفاقاً کہہ بیٹھا۔ توتی جپاروونا نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن ایک عجیب قسم کی ھچکی لےکر رہ گئیں۔ میرا موڈ بالکل خراب ہو گیا۔ مجھے بڑا افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بڑھیا کے دل کو ٹھیس پہنچا دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میں تو ان کے پاس انتہائی نیک ارادے سے گیا تھا۔ ان کو سیر کی دعوت دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اچانک پھنکار اٹھیں۔ یہ بھی تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ میں نے کنڈیڈیٹ کا مقالہ کوئی نہیں لکھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ مجھ میں خودداری ہی باقی نہیں رہی۔

* * *

موسم‌گرما نقطہ عروج کو پہنچ جاتا ہے تو ریگستان میں اندھیرا ہوتے ہی چھل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں دور چرواھوں کے جلائے ہوئے الاؤ ٹمٹماتے دکھائی دیتے ہیں، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی

کے لئے عنقریب ماسکو سے اکاڈیمیشین خراپچینکو بھی آ رہے ہیں۔ اسی سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اب ہماری سرگرمیوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔

"قاراباش یمودوِوچ!" توتی جپاروونا سربراہ کی بات کاٹتے ہوئے بول اٹھیں۔ "یہ بات ہے تو ہمیں مہمان کا مناسب طریقے سے استقبال کرنے کی تیاری کرنی چاہئے۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سربراہ کی تمام باتوں میں توتی جپاروونا کے لئے سب سے اہم یہی بات تھی کہ اکاڈیمیشین خراپچینکو آ رہے ہیں۔

آلماگل نے ایک معنی‌خیز نگاہ مجھ پر ڈالی اور قاراباش یمودووچ نے ہمیشہ کی طرح نرمی اور ادب سے کہا:

"جی ہاں، توتی جپاروونا! بےشک ہم مہمان کا استقبال ویسا ہی کریں‌گے جیسا ہمارے ضوابط اور ہماری روایتی مہمان‌نوازی کا تقاضا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ میخائیل پیتروِوچ بحیرۂ اسود کی سیر کے لئے تو آ نہیں رہے ہیں۔ وہ اپنے اس دورے سے زیادہ آرام وتفریح کی امید نہ رکھتے ہوں‌گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر انہیں ہماری سرگرمیوں کے سائنسی معیار کے تسلی‌بخش ہونے کا یقین ہو گیا تو اس سے انہیں اتنی مسرت ہوگی جتنی نہ عمدہ سے عمدہ کباب سے ہو سکتی ہے اور نہ ہی لذیذ سے لذیذ خربوزے سے۔"

اشیا فراہم کرنےوالے نے بڑی التجا کے انداز میں کہا:

هم گاڑی پر چڑھے کسی خرگوش کا پیچھا کر رھے ھیں...

بالآخر قاراباش یمودووچ نے هم سب کو جلسے میں بلایا: اشیا فراهم کرنےوالے کو، ریڈیوآپریٹر کو اور مجھ کو بھی۔ انهوں نے بتایا که عشق‌آباد میں ایک مشاورتی جلسه هوا هے جس میں فیصله کیا گیا هے که نهر قراقم کی تعمیر کے کام کو تیز کیا جائے۔ همیں یه بھی معلوم هوا که نهر کو ملک‌گیر اهمیت کا پروجیکٹ قرار دیا گیا هے اور اس سے متعلق تمام اهم مسائل ماسکو میں حل کئے جائیں‌گے۔ سربراه نے همیں یه خبر پرمسرت اور کسی حد تک جوشیلے انداز میں سنائی۔

قاراباش یمودووچ کی باتیں سنتے هوئے میں دل هی دل میں سوچنے لگا که اب همارے هاں بھی شاید کام دوسرے ڈھنگ سے چلنے لگےگا۔ میرا خیال درست ثابت هوا۔ قاراباش یمودووچ نے کہا که نهر گولوونائے – قارا دیپے کے مجوزه راستے کے پهلے سو کلومیٹر کا اچھی طرح جائزه لیا جا چکا هے۔ اس سلسلے میں سابق اور موجوده ٹیموں نے کافی بڑا کام انجام دیا هے۔ اب همیں نهر کے قارادیپے – اینچےکول والے حصے کی جانچ پڑتال کرنی هے۔ نهر کا یه حصه بڑا پیچیده هے، یهاں ٹیلے هی ٹیلے هیں۔ یه هماری ٹیم کی سرگرمیوں میں ایک سب سے اهم، فیصله‌کن مرحله هوگا۔ هماری ٹیم میں کچھ نئے علمی کارکن آکر شامل هوں‌گے اور وه علمی تحقیق کے لئے ضروری آلات اور ساز و سامان سے پوری طرح لیس هو جائےگی۔ یهی نهیں، همارے کام کا جائزه لینے

هوں که جلدبازی نه کیجئے، سوچ سمجھکر قدم آگے بڑھائیے!"

"توتی جپارو ونا، آپ جو کچھ کہنا چاهتی هیں ذرا صاف صاف کہئے" سربراه نے اپنی عینک کو ٹھیک کرتے هوئے کہا۔

"صاف صاف کہوں؟ تو لیجئے سنئے" توتی جپاروونا نے ویسے هی جوش سے کہنا شروع کیا۔ "مجھے یقین هے که آپ عشق‌آباد میں لمبے چوڑے وعدے کرکے آئے هیں۔ آپ نے وعده کر لیا هے که هم اپنے تمام کام قلیل سے قلیل مدت میں پورے کر دیں گے، عنقریب تمام معلومات فراهم کر دیں گے۔ میں ٹھیک کہتی هوں یا نہیں؟ ٹھیک هی تو کہه رهی هوں۔ آپ کو جانتی نہیں هوں کیا! لیکن ان وعدوں سے کوئی فائده نہیں هے، قاراباش۔ نہر کی تعمیر بہت هی دور کی بات هے... اتنے دور کی که بس سراب هی سمجھئے۔ تحقیقی ٹیمیں قریب پچاس سال سے قراقم ریگستانوں میں گھوم پھر رهی هیں اور ابھی تک یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی هے۔ هر قسم کی قراردادیں، فیصلے..."

"توتی جپاروونا! آپ کا یه رویه مجھے بالکل پسند نہیں هے" سربراه نے انہیں ٹوکا۔

"ارے چھوڑئے بھی، قاراباش!" توتی جپاروونا نے هاتھ جھٹک کر کہا۔ "آپ خود هی اچھی طرح جانتے هیں که یه سب باتیں جیسے ریت پر لکھی هوئی هیں۔ میں یه تو نہیں کہتی که کام بند کر دیا جائے۔"

سربراه سے نه رها گیا۔ انہوں نے سختی سے کہا:

"قاراباش یمودووچ! دعوت کے بغیر بھلا کیسے کام چلے گا؟ کوئی معمولی آدمی تھوڑی آ رہا ہے! دعوت کا انتظام کیوں نہ کیا جائے؟ ان دنوں پھلوں سبزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تربوز بھی پکنے لگے ہیں۔"

"ارے دوستو! آپ لوگوں نے میرا مطلب غلط سمجھا" قاراباش یمودووچ نے جواب دیا۔ "دعوت کے سلسلے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور جہاں تک پھلوں سبزیوں کا تعلق ہے کامریڈ آق‌ممیدوف تو آپ کو معلوم ہونا چاھئے کہ صرف مہمان آنے پر ھی ان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ٹیم کے لوگوں کو بھی یہ چیزیں برابر فراھم کرنا آپ کا فرض ہے۔"

"ارے قاراباش یمودووچ، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے! پھل بھی ضرور آئیں گے اور سبزیاں بھی!" اشیا فراھم کرنے والے نے وعدہ کیا۔

"اور پانی کا بھی انتظام کر لیجئے۔ ابھی غنیمت ہے کہ ھم آبادی سے زیادہ دور نہیں آئے ھیں۔"

"پانی کی بات ذرا مشکل ہے" اشیا فراھم کرنے والے نے کہا۔ "اس میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"پانی کا تو کوئی باقاعدہ انتظام ھی نہیں ہے!" توتی جپاروونا بول اٹھیں۔ "اس حالت میں ھم ٹیم کی سرگرمیوں کو اور زیادہ وسعت کیسے دے سکتے ھیں؟ یہ تو اپنے اوپر ناقابل عمل ذمےداریاں لینے کے برابر ہے! ارے قاراباش! میں آپ سے بار بار کہہ چکی

اس کی اشد ضرورت ھے ورنہ قارادیپے - اینچیےکول کے علاقے میں ھمارے کرنے کا کوئی کام ھی نہیں ھے۔ اور یہ بڑے افسوس کی بات ھے کہ جب ھم کو انتہائی نازک مرحلہ طے کرنا ھے تو توتی چپاروونا جیسی تجربہ‌کار کارکن کنارہ‌کشی اختیار کر رھی ھیں۔ اس وقت سوال یہ ھے کہ نشیب نشیب چلا جائے جیسا کہ توتی چپاروونا اصرار کر رھی ھیں یا ٹیلوں پر سے ھوکر چلا جائے جیسا کہ کچھ سائنس‌دانوں کا خیال ھے۔ سیدھی سی بات ھے: یہ سوال حل کئے بغیر ھم کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اس سلسلے میں شائع ھونےوالے تازہ‌ترین مضامین پڑھ چکی ھوں اور آخرالذکر نقطۂ نظر کی طرفدار ھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں... میرے خیال سے تحقیق و تفتیش کا کام شروع کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ھے کہ کس جگہ پر اور کس بات کی تحقیق و تفتیش کی جائے۔ توتی چپاروونا کا خیال ھے کہ بات بالکل صاف ھے اور بحث و مباحثہ کی کوئی گنجائش نہیں ھے لیکن میں سمجھتی ھوں کہ اس مسئلے پر غور و خوض ابھی شروع کیا جائے۔"

"یہ تو ٹھیک ھے" قاراباش یمودووچ نے کہا۔ "لیکن ھم کو ابھی دوسری جگہ منتقل ھو جانا چاھئے۔ ابھی، اس مسئلے کے حل ھونے کا انتظار کئے بغیر۔"

"آخر اتنی جلدی کیوں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ماھرین موسمیات کا کہنا ھے کہ کچھ ھی دنوں کے اندر اندر گرمی پینتالیس ڈگری تک پہنچ جائےگی" سربراہ نے اطلاع دی۔

"توتی جپاروونا! میں چاهتا هوں که آپ یه جاهلانه باتیں بند کریں!"

توتی جپاروونا اچھل کے اٹھ کھڑی هوئیں اور ته هونےوالی هلکی کرسی گر گئی۔

"اچھا یه بات هے! تب پھر میں چلی" انهوں نے کہا۔ "قانون کی رو سے میرے چھٹی پر جانے کا وقت آ گیا هے۔ آپ میری چھٹی کی درخواست منظور کیجئے۔"

"آپ نے مجھے چھٹی کی درخواست دی هی نهیں" سربراه نے کہا۔

"بس دو منٹ کے بعد وہ آپ کے هاتھ میں هوگی" توتی جپاروونا نے کہا اور لڑھکتی هوئی سی خیمے سے باهر نکل گئیں۔ قاراباش یمودووچ ان کو جاتے هوئے دیکھتے رهے۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رهے اور پھر هم سے مخاطب هوکر پوچھا:

"آپ میں سے کسی کو کچھ کہنا هے؟"

سب چپ رهے۔

"اور آپ کامریڈ اسلانووا؟ آپ کچھ کہنا چاهیں گی؟"

آلماگل نے اپنے شانوں کو هلکی سی جنبش دی اور کہا:

"مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہه چکی هوں۔ بھلا اور کیا کہه سکتی هوں؟ آپ نے بتایا هے که ٹیم میں کچھ نئے سائنسی کارکن آئیں گے، آلات اور سامان میں اضافه هو جائےگا۔ یه بهت اچھی بات هے۔ دراصل

یمودووچ نے کاغذ کو پڑھے بغیر ہی اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"مجھے تم پر رشک آتا ہے، میرگین!" انہوں نے کہا۔ "کاش میں بھی تمہاری طرح یقین کے ساتھ بول سکتا؟.." پھر انہوں نے سب لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا: "اچھا دوستو! اب اس پر ہمارا جلسہ ختم۔" پھر وہ دوبارہ میری طرف مڑے: "میرگین! تم کل سے الاش کے ماتحت ہوگے۔ تم دونوں کیرکی جاکر سامان لاؤگے۔ جتنی بھی چیزیں ضروری ہوں سب خرید لانا۔ جونہی تم لوگ واپس آؤگے ہم سفر کی تیاری شروع کر دیں گے!"

... میں اپنے خیمے کے پاس کھڑا ان بلند و بالا یاقوتی تاروں کو دیکھ رہا تھا جو چند خیموں پر مشتمل ہمارے چھوٹے سے پڑاؤ پر انتہائی مستعدی سے روشنی برسا رہے تھے۔ شاعر لوگ ان بےکنار میدانوں کے یوں ہی گن نہیں گایا کرتے! اس موسم میں وہاں دریائےآمو کے کنارے لوگوں کو نہ دن کو چین ملتا ہے، نہ رات کو آرام۔ دن کو ایسی ناقابل برداشت گرمی اور امس ہوتی ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے اور رات کو ظالم مچھر ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ ان مچھروں کا خیال آتے ہی میرے سارے بدن میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔ اور یہاں حالت بالکل دوسری ہے! چاروں طرف سکون ہے، ہوا صاف و شفاف اور ہلکی پھلکی ہے... اور مچھر، ان کا تو نام ونشان ہی نہیں۔

اتنے میں ریڈیوآپریٹر الیکسئی سورین اپنے خیمے

"اچھا..." آلماگل اپنا سر ہلانے لگی۔ "یہ بات ہے تو بےشک جلد سے جلد منتقل ہو جانا چاہئے۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اپنی تجویز کے حق میں کچھ دلیلیں پیش کروں۔ میں کوشش کروں‌گی کہ یہ کام بہت جلدی پورا کر لوں..."

"اچھی بات ہے، آلماگل" سربراہ نے کہا۔ "آپ جاکے یہ کام کیجئے۔ اور ہم لوگ سفر کی تیاری کریں۔" پھر انہوں نے مڑکر مجھ سے پوچھا: "تمہارا کیا حال ہے، میرگین؟ کوئی شکایت ہے؟ کسی چیز کی کمی ہے؟"

"میرے لئے یا موٹر کے لئے" میں نے ہمیشہ کی طرح بھونڈا سا مذاق کرتے ہوئے پوچھا اور آلماگل کی طرف دیکھا۔ قاراباش یمودووچ نے اپنی نظروں سے میرا پیچھا کیا اور زیرلب مسکرا دئے۔ پھر کہا:

"میں پوچھ رہا ہوں کہ گاڑی تو ٹھیک ہے نا؟ سفر کے لئے تیار ہے؟"

"گاڑی بالکل ٹھیک ہے، قاراباش یمودووچ!" میں نے جواب دیا۔ "ہاں ذرا پرانی ہے۔ کافی گھس پس چکی ہے لیکن انجن کو میں نے ٹھیک کر دیا ہے۔ چل سکتی ہے۔"

اتنے میں توتی جپاروونا خیمے میں داخل ہوئیں، ہاتھ میں رخصت کی درخواست ہے اور چہرے پر عزم مصمم کی جھلک۔ انہوں نے کاغذ کو سربراہ کے سامنے رکھا اور الٹے پاؤں خیمے سے باہر نکل گئیں۔ قاراباش

"کیا منتر پڑھا رہے ہو؟" آلماگل کی آواز میرے کان میں پڑی۔ میں نے مڑکر دیکھا تو وہ پاس ہی کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کب آ گئی تھی۔

"منتر کیا پڑھاؤں گا۔ مشورہ دے رہا ہوں۔ ایک مشکل مسئلہ ہے۔ ہم خود کسی طرح حل نہیں کر پا رہے ہیں اور مشورہ کرنے کے لئے کوئی مل نہیں رہا ہے" یہ کہہ کر میں نے الیکسئی کو آنکھ ماری۔ "ہم بےچارے مرد عورتوں کے دل کا حال تو جانتے نہیں..."

"ہاں بات ایسی ہی ہے، آلماگل" الیکسئی نے کہا۔ "کیا آپ ہماری مدد نہ کر سکیں گی؟"

واہ! کمال ہے! کیا بات سوجھی ہے الیکسئی کو!

"کوشش کروں گی" آلماگل نے کہا اور وہ اور بھی قریب آ گئی۔ لیکن میرے پاس نہیں الیکسئی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"دیکھئے نا آلماگل" الیکسئی صورت حال کی وضاحت کرنے لگا، "اپنی بیوی سے ملنے کو بری طرح بےتاب ہو رہا ہوں۔ جی چاھتا ہے کہ یہاں سے جانے سے پہلے پہلے ان کو ایک بار دیکھ لوں۔ میرگین کا کہنا ہے کہ بیوی کو یہاں بلا لوں۔ بھلا میں ان کو کیسے بلا لوں۔ ان کی نوکری کا کیا ہوگا؟"

"ایسے مشورے دینے والے جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا!" یہ کہتے ہوئے آلماگل نے آگ برساتی ہوئی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔ پھر الیکسئی سے کہا:

سے نکل کر میری طرف بڑھا۔ مجھے معلوم ھے کہ مجھ سے ملنے کی ایسے کیا ضرورت پڑ گئی ھے۔ میرے ھاتھ اپنے گھر کو رقم یا خط بھیجنا چاھتا ھے۔ اس کا خاندان کیرکی میں رھتا ھے۔ جوان بیوی اور بچے ھیں جو بہار میں یہاں آکر پندرہ دن رہ گئے تھے۔

"کہو، کیا فرمائش ھے؟" میں نے الیکسئی سے پوچھا۔

اس نے چپ چاپ ایک چھوٹا سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

"کیا ھے؟ رقم ھے کہ محبت کا پیغام؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی ھے اور وہ بھی" اس نے مسکراتے ھوئے جواب دیا۔

"اور زبانی بھی کچھ کہہ دوں گا تمہاری کلاوا سے؟"

"اور کیا کہنا ھے؟ سوچتا تھا کہ یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار ان سے ملاقات کر لوں گا۔ لیکن دیکھتا ھوں کہ یہ ناممکن ھے۔ اگست میں مجھے چھٹی ملے گی، تب پھر..."

"اگر میں ان کو یہاں لے آؤں تو؟" میں نے تجویز پیش کی۔

الیکسئی نے مایوسی سے اپنا ھاتھ جھٹکا اور کہا:

"وہ اس جہنم میں کیوں آنے لگیں! پھر ان کی نوکری بھی تو ھے..."

"ارے نوکری کیا ھے! جب ان کا شوھر اپنے پاس بلا رھا ھو تو کوئی کیا کہے گا؟"

"یہ تمہیں ہو کیا گیا، آلماگل؟ کیا یہ سچے دل سے کہہ رہی ہو؟" میں نے بوکھلاکر پوچھا۔
"جی ہاں، سچ مچ۔ مجھے بدتمیزی بالکل پسند نہیں ہے!" جواب ملا۔

آلماگل نے اپنے شانے زور سے اچکائے اور اپنے خیمے کی طرف چل دی۔ میں نے اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں خواہ مخواہ اس پر مہربانیاں برساتا پھرتا ہوں۔ اب باز آیا۔ کسی لڑکی میں احساس خودی ہو تو یہ اچھی بات ہے لیکن اس قدر غرور کسے پسند آئے گا؟ آخر خودداری کا جذبہ مجھ میں بھی تو ہے...

جس دن ہمیں اپنے نئے اڈے کی طرف روانہ ہونا تھا اس سے ایک روز قبل شام کو الیکسئی نے مجھے اور آلماگل کو اپنے خیمے میں چائے پر بلایا۔ سچ پوچھئے تو الیکسئی نے مجھ کو بلایا اور اس کی بیوی کلاوا نے آلماگل کو۔ مجھے مدعو کرتے ہوئے الیکسئی نے یہ ضرور بتایا کہ آلماگل بھی آئے گی اور زیرلب مسکراتے ہوئے کہا: مجھے امید ہے کہ تمہیں اعتراض نہیں ہو گا۔

میں خیمے میں گیا تو آلماگل کو دیکھ‌کر دنگ رہ گیا۔ اب تک میں نے آلماگل کو ہمیشہ پتلون اور گھسی ہوئی بدرنگ قمیض ہی میں ملبوس دیکھتا آیا تھا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ فراک پہنے بیٹھی ہے، ہلکی پھلکی ریشمی فراک! اس لباس میں وہ بڑی حسین اور دلآویز نظر آ رہی تھی۔ نازک سی، ہلکی پھلکی سی لگ رہی تھی۔

"آپ ایک خط لکھکر اپنی بیوی سے ذرا نرمی سے التماس کرکے دیکھئے شاید وہ دو تین دنوں کی بلاتنخواہ چھٹی لےکر آ ھی جائیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا" میں نے اپنی صفائی دی۔

آلماگل نے میری طرف اس طرح اپنا ھاتھ جھٹکا جیسے کسی مکھی کو بھگا رہی ھو اور کہا:

"تمہاری بات میں نے سن لی ھے!"

الیکسئی نے اپنا خط واپس لے لیا اور اس میں کچھ اضافہ کرنے کے لئے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ ھم دونوں اکیلے رہ گئے۔ آلماگل نے خاموشی سے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور اپنا منھ موڑ لیا۔

"میرے رس بھرے سیب! کچھ تو کہو۔ ھم یونہی کھڑے رھیں گے کیا؟" میں لڑکی سے مخاطب ھوا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟" آلماگل نے پلٹ کر پوچھا۔

"میں کہہ رہا ھوں، کتنی دیر تک ھم اس طرح کھڑے رھیں گے، میرے رس بھرے سیب؟"

"ایک تو آپ کے ساتھ کھڑے رہنے کا میرا کوئی ارادہ ھی نہیں ھے" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دےکر کہا اور مجھے آپ کہہ‌کر مخاطب ھوئی۔ "دوسرے آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں آپ کی "سیب" ھوں؟ میری ماں نے آپ سے کوئی قلیم* تو لیا نہیں!"

---

* قدیم رسم کے بموجب دولہا کی طرف سے دلہن کو دی جانےوالی رقم اور تحائف۔ اڈیٹر۔

چال تھا، خوبصورت بوتلوں میں شراب رکھی تھی اور ہر پلیٹ کے پاس نیپکن رکھا ہوا تھا۔ اس حسن و نفاست کو تو کسی عورت کے فسوں‌کار ہاتھ ہی پیدا کر سکتے تھے۔

"ہمارے عزیز مردو!" کلاوا نے ناز و ادا سے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔ "کھانا سامنے میز پر رکھا ہے۔ اب ذرا خواتین کی خاطر مدارات کیجئے۔"

میں آلماگل کی پلیٹ میں سلاد رکھنے لگا اور ظاہر ہے کہ میزپوش کو خراب کر دیا۔

آلماگل نے مسکراکر سازش کرنے کے سے انداز میں مجھے آنکھ ماری اور دھبے کو نیپکین سے ڈھک دیا۔

"کیا پیوگی؟" میں نے بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آلماگل سے پوچھا۔

اس نے اپنے شانے اچکاکر حیرانی کا اظہار کیا۔ اس کی طرف سے کلاوا نے کہا:

"اگر آپ ہم کو صنف نازک خیال کرتے ہیں تو ہمیں ہلکی شراب دے سکتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم عورتیں کسی بھی بات میں مردوں سے پیچھے نہ رہیں گی..."

کہنے کو تو یہ بات اس نے بڑی جرأت سے کہہ دی لیکن وادکا کا ایک چھوٹا سا جام بھی پی نہ سکی۔ وادکا حلق میں اٹک سی گئی اور وہ کھانسنے لگی... آلماگل نے تو شراب کو چھوا بھی نہیں۔ جو بھی کہئے، صنف نازک تو صنف نازک ہی رہے گی۔ لیکن سلاد اور پیلمینوں کو انہوں نے بھی خوب ڈٹ کر کھایا، ہم مردوں

میں نے مالکن سے مخاطب ھوکر ذرا سا سر جھکاکر کہا:

"میں نے آپ کو انتظار کرایا ھے اس لئے معافی چاھتا ھوں۔"

کلاوا نے اپنی ھنسی دباتے ھوئے اسی انداز میں جواب دیا:

"ھم بڑی خوشی سے آپ کو معاف کر دیتے ھیں۔ لیکن ھماری مہمان کو کوئی شکایت ھو تو الگ بات ھے۔"

"آلماگل! تم مجھ سے ناراض تو نہیں ھو؟" میں نے نرمی سے سوال کیا۔

وہ مسکرائی اور سر کے اشارے سے کہا کہ نہیں۔

میں نے خیمے کا جائزہ لیا۔ اس کی صورت ھی بدل گئی تھی۔ ویسے تو الیکسئی فوجی ڈھنگ کا بڑا ھی سلیقہ شعار آدمی ھے۔ اس کے ھاں ھمیشہ ھر ایک چیز اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی رھتی ھے۔ سب کچھ درست ھوتا ھے۔ لیکن آج پورا سلیقہ ھی نہیں تھا بلکہ خیمہ اس طرح سجا ھوا تھا جیسے کوئی جشن منایا جا رھا ھو۔ چھوٹی سی فولڈنگ میز پر صاف ستھرا سفید میزپوش بچھا ھوا تھا اور اس پر ایسی ایسی چیزیں چنی ھوئی تھیں کہ دیکھتے ھی منھ میں پانی بھر آتا تھا۔ سلاد تھا جو سبزی کی پتیوں اور ٹماٹر کے ٹکڑوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ خوشبو بکھیرتے ھوئے پیلمین* تھے،

* گوشت سے بھرے چھوٹے چھوٹے ابلے ھوئے سموسے۔

"گورکا! گورکا!" الیکسئی بھی چلایا۔

میرے چہرے پر کیا کیفیت طاری ہوئی یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن ہاں آلماگل کے چہرے سے حیرت ٹپکنے لگی۔ اس کا چہرہ لالہ کی مانند سرخ ہو گیا۔

"آخر مطلب کیا ہے؟ یہ کیسا عجیب و غریب مذاق ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"یہ کوئی مذاق نہیں ہے" کلاوا نے اس کے شانے پکڑکر زور سے لپٹاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں ایک ساتھ رہوگے۔ میری نظر نہیں چوکتی۔ تم لوگ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہو۔"

میں ابھی کچھ نہیں کہہ پایا تھا (کہتا بھی تو کوئی سلیقے کی بات شاید ہی کہہ پاتا) کہ قاراباش یمودووچ اچانک خیمے میں داخل ہوئے۔ وہ شاید چیخ پکار سن‌کر چلے آئے تھے۔ کلاوا نے فوراً ہی انہیں بھی ہلکی شراب کا ایک گلاس پیش کیا۔ وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گئے اور گلاس ہاتھ میں لےکر بڑے جوش اور مسرت سے کہا:

"اچھا دوستو! ریگستان کی کسی تحقیقی ٹیم کے سربراہ کو اتھاہ سمندر میں سفر کرنےوالے کسی جہاز کے کیپٹن ہی کے جیسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہاں سوویت حکومت کا ایک بااختیار نمائندہ ہوں اور کماحقہ شعبۂ اندراج حالات انسانی کے فرائض انجام دے سکتا ہوں۔

شادی کا اندراج کرنے کے لئے تو میرے اختیارات

سے ذرا بھی پیچھے نہ رھیں۔ کھانا بےحد لذیذ تھا۔ میں نے اقرار کیا کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسا لذیذ سلاد نہیں کھایا تھا۔ الیکسئی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: "ھاں کلاوا کو کھانا پکانے میں بڑی مہارت حاصل ھے۔ ایک طرح سے اسی لئے میں نے ان سے شادی کی ھے۔"

"اگر یہ بات پہلے سے معلوم ھوتی تو میں تمھیں مشورہ دیتی کہ تم شادی خالہ لیوسا سے کرو" کلاوا نے جواب دیا۔ "ھاں وہ ذرا پکی عمر کی ھیں لیکن سلاد وہ اور بھی اچھا بنا لیتی ھیں۔"

میں خیمے کے اندر ایک سجی سجائی میز کے پاس ان پیارے لوگوں کے ساتھ بیٹھا ھوا تھا جن کے دل محبت اور ھمدردی سے بھرے ھوئے تھے، ھنسی مذاق کر رھا تھا، انتہائی خوش‌ذائقہ سلاد اور انتہائی لذیذ پیلمین کھا رھا تھا اور رہ رہ‌کے محسوس کر رھا تھا کہ آلماگل مجھے دیکھ رھی ھے۔ کتنا مزا آ رھا تھا اس سب میں!

اچانک کلاوا نے ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھا، پھر آلماگل پر نظر ڈالی۔ انھوں نے میز پر سے بوتل اٹھاکر سب گلاسوں میں ھلکی شراب انڈیلی اور پھر کھڑی ھوکر اونچی آواز سے کہہ اٹھیں:

"گورکا!" *

---

* اس لفظ کے ذریعے روسی قوم کی ایک رسم کے بموجب شادی کی ضیافت میں لوگ دولھا دلھن سے ایک دوسرے کا بوسہ لینے پر اصرار کرتے ھیں۔ اڈیٹر۔

"تو کیسی لگیں کلاوا؟ مشکل‌کشا ثابت ہوئیں کہ نہیں؟"

"ھاں بےحد مشکل‌کشا ھیں تمہاری کلاوا" میں نے جوش سے کہا۔ "وہ شاید لوگوں کے دل ملانے کے لئے ھی پیدا ھوئی ھیں۔"

"اور آپ کی بھی یہی رائے ھے، آلماگل؟" الیکسئی نے سوال کیا۔

آلماگل دھیرے سے ھنسی اور میرے بالوں کی ایک لٹ کو جو میری پیشانی پر آ گئی تھی، اوپر کر دیا۔

وہ بہت خوش تھی۔ میں بھی بےحد خوش تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ھمارا قافلہ سفر پر نکلا۔ سب سے آگے میری گاڑی جا رھی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے قاراباش یموودوچ کی "گازیک" تھی جسے وہ خود چلا رھے تھے۔ اور سب سے پیچھے ھمارے سامان فراھم کرنےوالے الاش آق‌ممیدوف اس گھوڑے پر سوار آ رھے تھے جس پر اب تک توتی جپاروونا سوار ھوا کرتی تھیں اور جو اب چھٹی پر چلی گئی تھیں۔

میں ایک بالکل نئی نویلی گاڑی "گاز - ۵۱" چلا رھا تھا جسے دو ھی دن قبل ایک ڈرائیور لاکر دے گیا تھا۔ یہ گاڑی بہت عمدہ اور زیادہ طاقتور تھی اور پھر یہ بات بھی کہ پانی کی ٹنکی گاڑی سے جڑی ھوئی تھی۔ پھر بھی پرانی گاڑی کو چھوڑتے ھوئے مجھے دکھ ھوا۔ ویسے اس میں خرابیاں بہت تھیں۔ اس کا انجن بھی بالکل عذاب جان تھا۔ مجھے کتنی ھی بار اس کی مرمت

غالباً کافی نہیں ھیں لیکن منگنی کی گواھی دینے کے لئے کافی ھی نہیں اس سے بھی زیادہ ھیں! معلوم نہیں آپ لوگ اپنی شادی میں ھم کو بھی بلائیں گے یا نہیں اس لئے میں ابھی، اسی دم اپنی اس دلی تمنا کا اظہار کر دینا چاھتا ھوں کہ آپ لوگ ھمیشہ خوش و خرم رھیں۔ اچھا دوستو! آپ لوگوں کی زندگی ھمیشہ سرشار و شاداب رھے" کہہ کر انہوں نے جام اپنے ھونٹوں سے لگایا۔

"ارے آپ لوگوں کو تحفے میں کیا چیز پیش کروں؟" قارابناش یمودووچ نے کہا اور کچھ پریشان ھوکر ادھر ادھر دیکھنے اور اپنی جیبوں کو اس طرح ٹٹولنے لگے جیسے سگریٹ تلاش کر رھے ھوں۔ پھر "آھاھاھا! یہ ھے!" کہہ کر اپنے گلے میں لٹکی ھوئی دوربین کو اتار کر آلماگل کو پیش کیا اور کہا: "یہ آپ کو چھوڑ کر جہاں بھی جائیں آپ اس کے ذریعے ان کو کسی بھی وقت دیکھ سکیں گی۔"

آلماگل کھلکھلاکر ھنس پڑی۔

اس طرح ھماری منگنی ھو گئی۔

اگلے دن علی الصباح کلاوا گھر واپس چلی گئیں۔ ایک ڈرائیور میرے لئے ایک نئی گاڑی لایا تھا اور پرانی گاڑی کو لےکر واپس جا رھا تھا۔ وھی ڈرائیور کلاوا کو اپنے ساتھ لے گیا۔

کلاوا کو جنھوں نے ھماری منگنی طے کرائی تھی، رخصت کرنے ھم بھی نکلے۔ کلاوا والی گاڑی نظروں سے اوجھل ھو گئی تو الیکسئی نے ھم سے پوچھا:

کوشش کرتی تھی: "ارے میرگین! تم پھر مجھ کو تکنے لگے! راستے کو دیکھو! راستے کو!" اور اپنے الفاظ کو نرم بنانے کے لئے کبھی اپنا ھاتھ میرے کندھے پر رکھ دیتی اور کبھی میرے ماتھے پر گرے ھوئے بال ٹھیک کر دیتی...

دوپہر کے قریب ہم مٹی‌والی نشیب میں آ گئے۔ گاڑی کی رفتار ذرا تیز ھو گئی۔ اب اعصاب کو ذرا ڈھیلا کرنے کا موقع مل گیا۔ اتنے میں اچانک پیچھے بیٹھے ھوئے لوگوں میں سے کسی نے کیبن کی چھت کو زور زور سے تھپتھپانا شروع کر دیا۔ میں نے رفتار ذرا کم کر دی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"میرگین! ذرا اس طرف دیکھو۔ کچھ کالا سا نظر آ رھا ھے۔ ارے اس طرف نہیں، ذرا جنوب کی طرف" کسی نے کہا۔

میں نے دیکھا تو بہت دور جہاں سے سرسراتی ریت کے ٹیلے شروع ھوتے تھے کچھ کالے کالے نقطے سے رینگتے ھوئے نظر آئے۔ آلماگل نے اپنی دوربین جو کل تحفے میں ملی تھی، اٹھا لی اور گاڑی سے نیچے اتر گئی۔

"بھیڑیں ھیں... کچھ زیادہ نہیں ھیں... کچھ لوگ بھی ھیں..." اس نے کہا اور دوربین میری طرف بڑھائی۔

ابھی منزل تک کم و بیش بیس کلومیٹر کا فاصلہ باقی تھا۔ یہ راستے کا سب سے دشوار حصہ تھا لیکن ان لوگوں اور بھیڑوں کے پاس پہنچ کر ان کا حال معلوم کرنا لازمی تھا۔ ریگستان کا قاعدہ ھی یہی تھا۔ خاص طور پر اب جبکہ پانی کی شدید قلت تھی۔ ھمارے پاس

کرنی پڑتی تھی۔ لیکن میں نے جب ایک اجنبی آدمی کو اپنی اس "بوڑھیا" کا اسٹیرنگ وھیل پکڑتے دیکھا تو ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سینے میں خنجر چبھو دیا ہو۔ جانے کتنے دنوں تک ہم دونوں مل کر ریگستانوں میں سفر کرتے رہے تھے!..

صبح سے دوپہر ہوتے ہوتے ہمیں راستے میں مویشیوں کے کئی گلے ملے جن کو چرواھے تختہ‌بازار کے ٹیلوں کی طرف ھانکے لئے جا رہے تھے۔ ان دنوں ریگستان میں مویشیوں کا برا حال تھا۔ چاروں طرف چلچلاتی دھوپ تھی۔ نہ کہیں ھریالی کا نام و نشان تھا نہ ھی مویشیوں کو پلانے کے لئے پانی۔ مویشیوں کو بہت دھیرے دھیرے ھانکنا پڑتا تھا ورنہ وہ ایک ایک کر کے مرنے لگتے۔ میری گاڑی پر ٹنکیوں میں جو پانی تھا اس کے چھل چھل کرنے کی آواز سن کر بھیڑیں گاڑی سے چمٹنے لگتی تھیں جیسے مکھیاں شہد پر ٹوٹتی ھیں۔ لیکن ہم کرتے بھی تو کیا کرتے؟ ہم تو ریگستان سے گزر رہے تھے، اپنا پانی ان کو کیسے پلا دیتے؟

راستہ بہت ھی دشوار تھا۔ گاڑی کو بہت ھی احتیاط سے چلانا پڑتا تھا جیسے وہ تنگ اور ھلتے ہوئے پل پر سے گزر رہی ہو، نہ ادھر ذرا بھی مڑ سکتی ہو نہ ادھر۔ گاڑی پہیوں کے بنائے ہوئے قدرے پکے راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر ہو جاتی تو اس کے پہیے ریت میں دھنس جاتے۔ اور وہ راستہ بھی ریت کی موٹی تہ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ آلماگل جو کیبن میں میرے ساتھ بیٹھی تھی رہ رہ کے مجھ کو ہوش میں لانے کی

جس دن ہم اپنے نئے اڈے قولانلی پہنچے اس کے ہفتے بھر بعد ہمارے سربراہ قاراباش یمودووچ نے وائرلیس کے ذریعے مرکزوالوں سے دریافت کیا کہ ٹیم میں نئے افراد کے تقرر کا معاملہ طے ہو گیا کہ نہیں اور اکاڈیمیشین خراپچینکو کی آمد کا سوال کس مرحلے میں ہے۔ جواب ملا کہ اکاڈیمیشین خراپچینکو کا آنا غیرمتعین مدت کے لئے ملتوی ہو گیا اور نئے افراد کا مسئلہ بھی ابھی جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔

تب میں نے قاراباش یمودووچ کو پہلی بار آپے سے باھر ہوتے ہوئے دیکھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا! کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا!" کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور خیمے کے اندر بےچینی سے ٹہلنے لگے۔ "آخر یہ کیا تماشا ہے! توتی کی بات کی تصدیق ہو رہی ہے کیا؟ کیا واقعی ہمارے احمقانہ جوش اور ولولے کی کسی کو ضرورت نہیں ہے؟"

آلماگل اٹھکر ان کے پاس آئی اور تسلیآمیز لہجے میں کہا:

"قاراباش یمودووچ! آئیے ہمارے ہاں چلئے۔ میں آپ کو چائے پلاؤں گی۔ یہاں کا پانی لاجواب ہے۔ کتنی عمدہ چائے بنتی ہے اس سے!.. چھوڑیے بھی۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"دیکھئے نا آلماگل!" قاراباش یمودووچ نے تڑپتے ہوئے کہا۔ "کتنی ناقابل فہم بات ہے یہ سب!"

گاڑیاں تھیں، پانی کی فراوانی تھی اور پانی وہ چیز ہے جس کا ایک پیالہ بعض دفعہ کسی آدمی کی جان بچا سکتا ہے۔ میں نے قاراباش یمودووچ کی آمد کا انتظار کئے بغیر گاڑی کا رخ اس طرف کر دیا جدھر کالے کالے نقطے نظر آ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا قاراباش یمودووچ سے یہی ہدایت ملے گی۔

سب سے پہلے ایک بھیانک سفید و سیاہ کتے نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ گاڑیوں پر اچھل اچھل‌کر زور زور سے بھونک رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پیاسا نہیں ہے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

ایک سائبان کے نیچے دو بوڑھے بیٹھے تھے۔ ان کے سر سرخ رنگ کے کپڑوں سے ڈھکے تھے۔ ان کے ارد گرد ڈنڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ دونوں کنوئیں کے اوپر رکھنے کے لئے چھپر تیار کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنے کام میں لگے لگے ہی ہمارے سلام کا جواب دیا اور بیٹھ‌کر ایک ایک پیالہ چائے پینے کے لئے کہا۔ ہم نے کہا کہ جلدی میں ہیں، اپنا راستہ چھوڑ‌کر ادھر بس اس لئے آئے ہیں کہ دیکھیں کہ آپ لوگوں کا کیا حال ہے، سب ٹھیک تو ہے؟

"بہت اچھا کیا آپ لوگوں نے" بوڑھوں میں سے ایک نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "بس ایک ایک پیالہ چائے پیجئے اور اپنے راستے پر جائیے۔ شکر اللہ کا، ہمارے ہاں سب ٹھیک ہے..."

ہم نے چائے پی اور اپنے راستے پر روانہ ہو گئے۔

کہیں اسی طرف سے گزرے گی۔ یہاں تو زمین کے اندر پانی بہت زیادہ گہرائی پر ہے۔"

"اور وہاں؟ کیا وہاں پانی نسبتاً کم گہرائی پر موجود ہے؟ کیا آپ نے اس کا جائزہ لیا ہے؟" قاراباش یمودووچ نے پوچھا۔

"جی ہاں، وہاں یہاں کے مقابلے میں بہت کم گہرائی پر ہے۔ آپ کو وہ بوڑھے یاد ہیں جو کنواں کھود رہے تھے؟ میں نے دیکھا تھا کہ پانی سطح زمین سے بہت قریب ہے۔ اور قارامیت‌نیاز بھی تو اسی سطح پر واقع ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے" قاراباش یمودووچ نے کہا اور کچھ وقفے کے بعد پھر بولے: "لیکن پھر وہی بات۔ پھر وہی ٹیکنیکل وسائل کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے! ان کے بغیر ہم تحقیق و تفتیش کے کام کو کسی طرح انجام نہیں دے سکتے!"

اس کے بعد دو ہفتے اور گزر گئے۔ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہوئی۔ نہ نیا ساز و سامان آیا نہ نئے کارکن۔ اگست کے آخری دنوں میں آلماگل کی عملی تربیت کی مدت ختم ہو گئی اور میں نے اس کو کیرکی لے جاکر ٹرین پر سوار کرا دیا۔ ہم نے طے کیا کہ موقع ملتے ہی میں چھٹی لے‌کر اس کے پاس آ جاؤں‌گا لیکن مجھے جلد ہی ایسا موقع ملنے کی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ہم خاصے طویل عرصے کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

"قاراباش یمودووچ! آپ ھی نے تو کہا تھا نا کہ تحقیقی ٹیم کے سربراہ کی حیثیت کسی جہاز کے کیپٹن جیسی ھوتی ھے۔ ھم تو ادنی ملاح ھیں۔ ھم اگر سراسیمہ ھو جائیں، ھمت ھار بیٹھیں تو یہ دوسری بات ھے لیکن آپ ٹھہرے کیپٹن۔ آپ تو ایسا نہیں کر سکتے!"

"آلماگل! میں ایک ماھر ارضیات ھوں، آوارہ‌گردی کا عادی ھوں" قاراباش یمودووچ نے جواب دیا۔ "کوئی بھی تکلیف ھو، کوئی بھی ناکامی ھو، میرے قدم نہ ڈگمگائیں گے۔ لیکن عہدیداروں کی بےدلی اور بےپروائی!.. یہ بالکل الگ بات ھے۔ اس کو برداشت نہیں کیا جا سکتا! اور مزے کی بات یہ ھے کہ لڑا بھی نہیں جا سکتا۔ بالکل گیلے آٹے میں مکا مارنےوالی بات ھے!.. آخر ھمارا سارا کام اکارت جاتا ھے۔ آپ تو یہ بات سمجھتی ھیں شاید؟"

"ذرا صبر و تحمل سے کام لیجئے، قاراباش یمودووچ!" آلماگل نے پھر تسلی دی۔ "بہتر ھوگا کہ ھم ایک بات پر ذرا غور کرکے دیکھیں۔ میرے خیال سے جو دس دن ھم یہاں قولانلی میں گزار چکے ھیں وہ بےکار نہیں گئے ھیں۔ ان دنوں کے تجربے سے ھم کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ھیں... میرا خیال ھے کہ ھم نے اپنے اڈے کے لئے جگہ کا انتخاب غلط کیا ھے۔ یہ تو ابھی محض ایک خیال ھے اور یہ دیکھنا ھوگا کہ یہ خیال کہاں تک ٹھیک ھے۔ پھر بھی اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتی ھوں کہ ھمیں قارامیت‌نیاز کے آس پاس اڈا جمانا چاھئے کیونکہ نہر

"نہر کے پہلے حصے کا نقشہ تیار کرنے میں تمہاری آلماگل نے بھی حصہ لیا ھے" قاراباش یمودووچ نے بڑی مسرت کے ساتھ بتایا۔

"اور توتی جپاروونا؟" میں نے پوچھا۔

"هاں ضرور حصہلیا" قاراباش یمودووچ نے جواب دیا۔ "انہوں نے تو هماری ناک میں دم کر دیا! بس یہی رٹ لگائے رهیں که نہر کو نشیب سے کھڈوں کھڈوں هوکر نکلنا چاهئے۔ هم اصرار کرتے رهے که نہر کو سیدھے قارادیپے سے قارامیت‌نیاز کی طرف جانا چاهئے۔ اس بات میں آلماگل پیش پیش تھیں۔ اس طرح سے نہر کی لمبائی پورے پچیس کلومیٹر کم هوگی۔ توتی هم کو اس دلیل سے مات کرنا چاهتی تھیں که اس صورت میں کتنے هی مکعب میٹر زیادہ زمین کی کھدائی کرنی هوگی۔ هم کہتے تھے که آج زمین کھودنے کی جدید مشینوں کی بدولت کچھ زیادہ زمین کی کھدائی سے اتنا نقصان نه هوگا جتنا نہر کی غیرضروری لمبائی سے هو سکتا هے۔ نہر جتنی لمبی هوگی اتنا هی زیادہ پانی بھاپ بن‌کر اڑتا اور زمین میں جذب هوتا رهےگا۔ اس طرح کتنا هی پانی ضائع هو جایا کرےگا۔

هم توتی اور ان کے حامیوں سے بحث کرتے کرتے تھک گئے اور آخرکار هم نے اس جھگڑے کو طے کرنے کے لئے اکاڈیمیشین خراپچینکو کو بلایا۔ انہوں نے آکر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا بھالا، کاغذات کا مطالعه کیا اور بالآخر هماری تجویز کی تائید کر دی" قاراباش یمودووچ نے اپنا قصه ختم کیا۔

... میں عشق‌آباد ۱۹۵۳ء کے موسم بہار میں لوٹا۔ آلماگل انسٹی‌ٹیوٹ کی سند پا چکی تھی، پوسٹ گریجویٹ کورس کر رہی تھی۔ ہم ان گزشتہ دو برسوں میں ایک دوسرے سے بہت کم ملے تھے لیکن آلماگل بڑی پابندی سے مجھے خط لکھتی رہی تھی۔ ہر دفعہ جب میں کسی سفر سے اپنے اڈے پر واپس آتا تو آلماگل کا خط ضرور میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ اس نے اپنا آخری خط زہمیت اسٹیشن سے بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں قارادیپے ہو آئی ہوں، کچھ مزید مواد یکجا کر لیا ہے اور اب کینڈیڈیٹ آف سائنس کی ڈگری کے لئے مقالہ تیار کر رہی ہوں۔

گاڑی قونغرات چارجو کے راستے عشق‌آباد جا رہی تھی۔ وہ آدھی رات کے وقت مری اسٹیشن پہنچی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی یہاں بیس منٹ رکے گی۔ میں ہواخوری کے لئے گاڑی سے اتر کے پلیٹ‌فارم پر چہل‌قدمی کر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا: "میر گین!" مڑ کر دیکھا تو قاراٰیاش یمودووچ نظر آئے۔

میں انہی کے ڈبے میں چلا گیا اور عشق‌آباد پہنچنے تک ہم دونوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

قاراباش یمودووچ نے بتایا کہ آلماگل بھی کل رات عشق‌آباد روانہ ہو گئی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ لیکن ایک بات اس سے بھی زیادہ پرمسرت تھی۔ معلوم ہوا کہ چھ مہینے ہوئے یہ بات طے ہو چکی ہے کہ نہر قراقم ریگستان کے جنوبی علاقوں، مری اور تیجین کے نخلستانوں سے ہو کر نکلے گی۔

"واقعی کتنی شاندار ہے آلماگل بھی! اپنی کامیابیوں کا کبھی ذکر ہی نہیں کرتی!" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ زندگی آگے بڑھتی جا رہی ہے، لوگ بڑے ہو رہے ہیں، مقالے لکھ رہے ہیں، کینڈیڈیٹ اور ڈاکٹر بن رہے ہیں اور میرگین! تم ہو کہ بدستور گاڑی کا اسٹیرنگ وھیل گھمائے چلے جا رہے ہو! یہ خیال آنے پر میں نے کہا:

"اور میں تو، قاراباش یمودووچ ویسے ہی گاڑی چلائے جا رہا ہوں..."

میرے ان الفاظ میں قاراباش یمودووچ کو شاید کچھ اداسی کی جھلک نظر آئی کیونکہ وہ مسکرا دئے اور اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر کہا:

"ارے پیارے میرگین! اگر سب لوگ مقالے لکھنے بیٹھ گئے تو "گاز – ۵۱" کو کون چلائے گا؟ زمین کھودنے کی جہازی مشینوں اور ایکسکویٹروں پر کام کون کرے گا؟ ریگستان میں بستیاں کون تعمیر کرے گا؟ ہم ماہرین تو حملے کا نقشہ ہی تیار کرتے ہیں۔ ہتھیار لےکر ریگستان پر حملہ دوسرے لوگ کرتے ہیں، تم جیسے لوگ!"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ میں ریگستان میں گھومنے پھرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں؟" میں نے کچھ ناراضگی کے ساتھ پوچھا۔ "اگر میں نے شہر کا آدمی بننے کا ارادہ کر لیا ہو تو؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہر کے پہلے حصے سے متعلق سوالیے حل ہو چکا ہے اور اب آرام سے سویا جا سکتا ہے۔ ہے نا؟" میں نے سوال کیا۔

"ارے آرام سے سونے کی بات ابھی کہاں ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔ "ہمارا نوزائیدہ بچہ ابھی بہت کمزور ہے۔ نقشہ تو خیر تیار ہو چکا ہے لیکن اسی پر قصہ ختم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ نقشے کو بروئے کار لاتے وقت موقع و محل دیکھتے ہوئے اس میں لازمی طور پر کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اس لئے نہر کھودنےوالوں سے رابطہ قائم رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک پاؤں عشق‌آباد میں رہتا ہے تو دوسرا پاؤں جائے تعمیر میں۔ میرا خیال ہے کہ قارامیت‌نیاز میں ایک عارضی مرکز قائم کرنا ہوگا اس لئے کہ نہر بیک وقت دونوں طرف کھودی جائےگی۔ گولوونائے سے شروع ہوکر مغرب کی طرف چلےگی اور مری سے شروع ہوکر مشرق کی طرف۔ تکنیکی وسائل بہت زیادہ میسر ہو چکے ہیں! آلماگل کو بھی قارامیت‌نیاز ہی میں رہائش اختیار کرنی ہوگی۔ رہا پوسٹ گریجویٹ کورس تو اسے خط و کتابت کے ذریعے مکمل کر لیں‌گی۔ وہ تو اب میرا دایاں ہاتھ ٹھہریں! ہاں ایک بات بتا دوں، وہ جو مقالہ تیار کر رہی ہیں نا وہ انہی ایام کے دوران حاصل کردہ معلومات پر مبنی ہے جب وہ ہمارے یہاں عملی تربیت کے سلسلے میں آئی تھیں۔ یاد ہیں تمہیں وہ ایام؟" یہ کہہ‌کے وہ ہنس دئے۔

"ارے واہ! یاد کیوں نہیں!"



بیردی کیربابائیف

پانی کا قطرہ، سونے کا ذرہ

(ناول کے کچھ ٹکڑے)

آبادان اجتماعی فارم کے کلب کا بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسان عشق‌آباد سے آنےوالے ایک لیکچرر کا انتظار کر رہے تھے جو انہیں یہ بتانےوالا تھا کہ زیر تعمیر نہر عظیم کی اہمیت کیا ہے۔

فارم‌والوں کو اس مسئلے سے گہری دلچسپی تھی اسی لئے مقررہ وقت پر کلب کے ہال میں جمع ہوکر بڑی بےتابی سے اس آدمی کا انتظار کر رہے تھے۔

سب کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں اور بہار کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہال میں داخل ہو رہی تھی جس میں تپتی ہوئی زمین اور تروتازہ گھاس کی فرحت‌بخش خوشبو بسی ہوئی تھی۔

اس موقعے پر آرتیق آغا بھی موجود تھے۔ دراصل نہر عظیم کی تعمیر کے سلسلے میں جہاں بھی کوئی اجتماع ہوتا تھا وہ ضرور شرکت کرتے تھے۔

جس آدمی کو لیکچر دینا تھا وہ نہ جانے کیوں نہیں آ رہا تھا۔

میرے سابق سربراہ نے شبہے کا اظہار کرتے ہوئے اپنا سر ہلایا اور کہا:

"نہیں۔ ہم تم دونوں سچ مچ کے شہر کے آدمی نہ بن سکیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہو چکا ہے۔ آج کل میں شہر میں رہنے کے لئے مجبور ہوں۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ اپنے آپ کو مہمان سا، اجنبی سا محسوس کر رہا ہوں۔ ہاں میرگین، ہم تم دونوں آوارہ لوگ ہیں! ہمیں تو بےکنار میدان ہی راس آتے ہیں! میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

میں نے اپنے شانے اچکا کے کچھ شک ظاہر کیا لیکن پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں" میں نے سوچا۔

"ہاں یہ بات ہے" انہوں نے کہا۔ "جلد ہی ہم دوبارہ قراقم کی راہ لیں گے! تیارشدہ نقشہ عملی شکل اختیار کر لے، نہر کا پہلا حصہ بن کر تیار ہو جائے تو ہم پھر ریگستان میں گھومتے پھرتے نظر آئیں گے۔"

ڈبے کے دوسرے سرے سے کنڈکٹر کی بلند آواز سنائی دی:

"محترم مسافرو! بیس منٹ کے بعد ہم عشق آباد پہنچ جائیں گے!"

که وه ذرا اس سوال کی وضاحت کر دیں، همیں بتا دیں که هماری جمهوریه کے لئے پانی کی کیا اهمیت هے۔

سب لوگوں نے چیرمین کی هاں میں هاں ملاتے هوئے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

آرتیق آغا با دل ناخواسته کھڑے هوئے۔ ان کے چهرے سے کچھ ناراضگی سی جھلکتی تھی۔ آخر انهوں نے کها:

"ارے ترخان! ذرا خدا سے تو ڈرو۔ لیکچر دینا میرے بس کا کام تھوڑی هے۔ میں تو نه کوئی انجینیر هوں نه کوئی ماهر آبپاشی۔۔۔"

"ارے ماهر آبپاشی کی کیا بات هے!" کوئی اونچی آواز میں کهه اٹھا۔ "پانی کی بات تو آپ کسی ماهر آبپاشی سے کهیں بهتر جانتے هیں۔"

"هاں ٹھیک هے۔ آپ هی کچھ بتائیے۔ هم آپ هی کی بات سننا چاهتے هیں" کسی نے تائید کی۔

"اسٹیج پر آ جائیے، آرتیق آغا" تیسرے نے کها۔

لوگ تالیاں بجاتے اور شور مچاتے رهے۔ آخرکار آرتیق آغا لاچار هوکر اسٹیج پر آ گئے۔ وهاں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اس کے پاس کھڑے هوکر آرتیق آغا نے ذرا شرارت کے ساتھ اپنی آنکھیں بھینچتے هوئے کهنا شروع کیا:

"لیکچر دینے کی مجھے کوئی مهارت تو نهیں هے۔۔۔"

هال میں پھر شور مچ گیا:

لوگ انتظار کرتے کرتے اکتا گئے اور شور مچانے لگے۔ اتنے میں اجتماعی فارم کے چیرمین ترخان‌ماوی کو جو هال هی میں پهلی قطار میں بیٹھے هوئے تھے، خبر دی گئی که ان کا فون آیا هے۔ معلوم هوا که فون عشق‌آباد سے آیا هے۔ فون کرنےوالے نے اطلاع دی که عشق‌آباد سے آنےوالا لیکچرر اچانک بیمار پڑ گیا هے۔

اس اطلاع کے موصول هونے پر ترخان‌ماوی نے پهلے تو سوچا که یه کهه‌کر که اب لیکچر نهیں هوگا لوگوں کو رخصت کر دیا جائے۔

لیکن پھر انهیں خیال آیا که جب لوگ یهاں جمع هو گئے هیں تو ان کو یوں هی چلے جانے دینا مناسب نهیں هے۔

چنانچه اس جلسے کے منتظمین اور فارم کے دیگر رهنماؤں سے صلاح مشوره کرنے کے بعد وه اسٹیج پر آ گئے اور حاضرین سے مخاطب هوکر کها:

"دوستو! ابھی ابھی اطلاع ملی هے که جن صاحب کا لیکچر سننے کے لئے هم اتنے بےتاب تھے وه بیمار هو گئے هیں۔ لیکن جب آپ لوگ آ گئے هیں تو یه یقیناً گناه هوگا که آپ کا شوق پورا نه کیا جائے اور آپ لوگوں کو یوں هی چلے جانے دیا جائے۔ اس وقت آپ لوگوں کے درمیان همارے معزز دوست آرتیق آغا بیٹھے هوئے هیں۔ وه نهر عظیم کی تعمیر کے مسئلے پر کسی بھی لیکچرر کی به‌نسبت زیاده اچھے ڈھنگ سے روشنی ڈال سکتے هیں۔ آئیے هم انهی سے درخواست کریں

جاندار مخلوق کو جھلساتا رهتا هے۔ یه تو آپ جانتے هی هیں که کسی تیز دھوپ‌والے دن ریت میں کوئی انڈا ڈال دیا جائے تو وہ پک جائے۔"

"هاں یه هم جانتے هیں، آرتیق آغا!"

"یه تو کھلی هوئی بات هے۔"

"اسی لئے تو پانی همارے لئے سونے سے زیادہ قیمتی چیز هے۔ هر جاندار پکار پکارکر پانی مانگتا هے۔ کپاس کا پودا زمین سے سر باهر نکالتے هی پانی کے لئے پکارتا هے۔ باغات گرمی سے بےحال هوکر پکارتے هیں: "پانی دو!" کسان یه دیکھ‌کر که پانی نه هونے سے ان کی سال بھر کی محنت ضائع هو رهی هے، اپنے خشک هونٹوں کو مشکل سے هلاتے هوئے حسرت سے بڑبڑاتے هیں: "پانی! پانی!"

"پتے کی بات کهه رهے هیں، آرتیق آغا" کسی نے پکارکر کہا۔

آرتیق آغا نے سلسله کلام جاری رکھا:

"آج سے دو سو پچاس سال پهلے کی، سن سترہ سو تیرہ کی بات هے۔ مغربی ترکمانستان میں بسنےوالے ابدل قبیلے کا ایک آدمی خوجا نیپپیس سویں اوغلی شهر خاجی‌ترخان گیا جو اب استراخان کهلاتا هے۔ وهاں روسی کنیاز* زامانوف سے اس کی جان پهچان هو گئی۔ اسی

---

* ایک زارشاهی خطاب جو پهلے موروثی تھا بعد میں انعام کے طور پر بھی دیا جانے لگا۔ اڈیٹر۔

"ارے ہمیں لیکچر سننے کی خواہش تھوڑی ہے۔"
"آپ جو کچھ جانتے ہیں بس وہی ہمیں بتائیے۔"
"مجھے تو بس کہانیاں سنانا ہی آتا ہے" آرتیق آغا نے اسی طرح آنکھیں سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ کہانی ہی سنائیے۔"
"ٹھیک ہے، یوں ہی سہی" آرتیق آغا نے لوگوں کو خاموش کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاکر کہا۔ "تو دوستو! آپ لوگوں نے یہ مقولہ ضرور سنا ہوگا "زمین ایک قالین بڑا، ہر دیش کا رنگ نرالا"۔ کہتے ہیں کہ یاقوتیا میں اتنی سردی پڑتی ہے کہ اگر پانی کو یوں پھینکا جائے تو زمین پر گرتے ہی جم جاتا ہے۔ اور افریقہ میں لوگ یہ جانتے ہی نہیں کہ برف کسے کہتے ہیں..."
"ارے دیکھو۔ آرتیق آغا سچ مچ ہی کوئی کہانی سنانے لگے ہیں" ہال میں کسی نوجوان کی پرمسرت آواز گونجی۔
آرتیق آغا نے طعنہ دینے کے انداز میں اپنا سر ہلاتے اور مسکراتے ہوئے کہا:
"ارے بیٹے! ہکلے کو ٹوکتے کیوں ہو؟ اسے اپنی بات تو کہہ لینے دو۔ ہاں تو ہمارے دیش کا جو قالین ہے اس کو بھی قدرت نے مخصوص نقش و نگار عطا کئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے یہاں سورج کتنا فراخدل ہے۔ وہ تو بہار سے لےکر خزاں تک اور صبح سے لےکر شام تک برابر آگ برساتا رہتا ہے،

هی گھڑسوار موت کا شکار ہو گئے۔ ادھر امیر خیوا شیرغازی بھی چپ چاپ نہیں بیٹھا رہا۔ تھکے ماندے سیاحوں کو پناہ دینے اور ان کو آرام پہنچانے کے بہانے اس نے روسی فوج کو اپنی سلطنت میں بلایا۔ اس نے ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا، خوب خاطر تواضع کی لیکن رات بسر کرنے کے لئے ان کو مختلف جگہوں پر ٹھہرایا۔ مطلب یہ کہ ان کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا اور پھر رات کو ان سب کا صفایا کر دیا۔ اس غدارانہ قتل عام کے وقت بیکووچ چیرکاسکی بھی ہلاک ہو گیا۔ یہاں کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ پانی کسی کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا پانی کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ امیرخیوا شیرغازی کی مکاری اور اندھیرگردی کے سبب پیتراول کا پانی سے متعلق منصوبہ خاک میں مل گیا اور ترکمان عوام کا خواب ہی رہ گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نیک آرزو کبھی بیکار نہیں جاتی۔ وہ لوگوں کو نیک کاموں کی ترغیب دیتی ہے۔ آج سے کوئی سو سال پہلے کی بات ہے کوشوت‌خان ترکمان لوگوں کا سردار بنا۔ اس نے ایرانی فوج کو جو ترکمانی سرزمین پر ٹڈی دل کی مانند چھائی ہوئی تھی، شکست فاش دی۔ پھر خیوا کے حکمران مدامین‌خان کی فوج کا قلع قمع کیا۔ اور جب اس سرزمین پر امن و امان قائم ہو گیا تو کوشوت‌خان کی تحریک پر اور اسی کی قیادت میں دریائے مرغاب پر کوشوت باندھ تعمیر کیا گیا۔ مگر آپ جانتے ہی ہیں

روسی کنیاز کی مدد سے وہ پیترس‌برگ پہنچا اور کسی نہ کسی طرح روس کے بادشاہ پیتر اول سے ملا۔ تو اس خوجا نیپیس نے اپنے ہم‌وطنوں کی طرف سے روس کے بادشاہ سے گزارش کی کہ وہ ان کو اپنی رعایا میں شامل کر لے۔ اس کے علاوہ خوجا نیپیس نے بادشاہ کو بتایا کہ پانی کی قلت کی وجہ سے ترکمان عوام کا کتنا برا حال ہے اور کتنی زرخیز زمین بنجر پڑی ہوئی ہے... اس نے کہا کہ اس زمین کی پیاس بجھانے کے لئے ضروری ہے کہ آمودریا کو بحیرۂ کیسپین کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہ بات روسی بادشاہ کو اچھی لگی۔ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ آمودریا کو بحیرۂ کیسپین سے ملا دیا جائےگا تو اس کے سامنے وسط ایشیا اور ہندوستان کے لئے راستہ کھل جائےگا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، اس کے دو ہی تین سال بعد پیتر اول کی ہدایت پر ماہرین کی ایک ٹیم بحیرۂ کیسپین کے راستے شہر کراسناوودسک پہنچی۔ یہاں آکر اس نے امیرخیوا سے چھپاکر سرزمین ترکمان کو دیکھا بھالا اور آمودریا کے پرانے پاٹ کی جو کہ بحیرۂ کیسپین سے جاکر ملتا تھا، تحقیق و تفتیش کی۔ ایسا لگتا ہے کہ روسی بادشاہ ترکمان عوام کی مدد کرنے کے لئے تیار تھا۔ سن سترہ سو سترہ میں اس نے اپنے ایک درباری کو جس کا نام الیکساندر بیکووچ چیرکاسکی تھا، چھ ہزار گھڑسواروں کے ساتھ بحیرۂ کیسپین کے مشرقی ساحل پر بھیج دیا۔ یہاں ان کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بےآب وگیاہ لق و دق صحرا کو پار کرتے وقت کتنے

"جی ھاں، سن سترہ میں تو..." آرتیق آغا کے چہرے پر بادل سا چھا گیا۔ "اس سال تو ہم نے پانی بالکل دیکھا ھی نہیں۔ اور کھیت سرے سے ھرے ھی نہیں ھو پائے۔ بھوک کے مارے لوگوں کے بدن پھول گئے اور خزاں کے آتے آتے کسی کو روٹی کا ذائقہ ھی یاد نہیں رہ گیا تھا... گھروں میں چولھے ٹھنڈے پڑے رھتے تھے۔ تندور بےکار پڑے پڑے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ قبرستان بھر گئے تھے۔ ایک قبر کی مٹی ابھی خشک نہیں ھو پاتی تھی کہ پاس میں دس نئی قبریں بن جاتی تھیں۔ جانے کتنے مویشی بھی مر گئے۔ تقریباً سب کے سب مر مٹ گئے۔ تو یہ حال ھے ھمارے تیجین کا... اس سے تو کوئی خاص امید نہیں رکھی جا سکتی۔ ارے گزرے ھوئے زمانے کی بات ھی کیوں کریں! آج ھی کی بات لیجئے۔ آج تو تیجین کا پھر وھی حال ھو رھا ھے۔ وہ پھر وھی سوکھے تھن‌والی گائے بن‌کر رہ گیا ھے جس سے کبھی کبھی تو دودھ کی ایک بوند بھی نصیب نہیں ھوتی۔ اسی لئے تو ھم کہتے ھیں کہ پانی کا قطرہ، سونے کا ذرہ۔ اور پہلے تو لوگ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ پانی کا قطرہ، خون کا قطرہ۔"

یہ کہہ‌کر آرتیق آغا کچھ دیر کے لئے خاموش ھو گئے۔ ھال میں بیٹھے ھوئے لوگوں میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا:

"آرتیق آغا! یہ بھی تو بتائیے کہ لوگ پانی کی خاطر آپس میں کس طرح لڑتے جھگڑتے تھے۔"

"ھاں ھاں، سنائیے نا۔ ھمارے نوجوانوں کو ان

که مرغاب سے صرف مری کی آبادی ھی کو پانی مل سکتا تھا...“

”اور ھمارا یه جو تیجین ھے، کیا اس کا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا؟“ ھال میں سے کسی نے پوچھا۔

”تیجین دریا تو بڑا سرکش واقع ھوا ھے۔ یه افغانستان میں آقداش پہاڑ سے شروع ھوتا ھے۔ چھوٹے چھوٹے نالے مل‌کر ایک دریا کی شکل اختیار کرتے ھیں اور وھاں اس کا نام بھی بالکل دوسرا ھے — گیری رود کہلاتا ھے۔ پل خاتین سے گزرنے کے بعد ھی یه تیجین کہلانے لگتا ھے۔ تیجین میں پانی چڑھتا اترتا رھتا ھے۔ کبھی زیادہ ھوتا ھے، کبھی کم۔ اس کا سبب یه ھے که جہاں سے یه دریا نکلتا ھے وھاں بارش کبھی زیادہ ھوتی ھے، کبھی کم۔ بہار کے دنوں میں یه اتنا زیادہ پھیل جاتا ھے که سمندر معلوم ھونے لگتا ھے اور گرمی کے دنوں میں تو بالکل سوکھ جاتا ھے۔ تب پھر کنوئیں کھودکر زمین کے اندر سے پانی نکالنا پڑتا ھے۔ چونکه یه دریا اتنی جلدی ھی سوکھ جاتا ھے اس لئے اس علاقے میں زیادہ‌تر اناج اگایا جاتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ھوتا تھا که بارش ھوتی ھی نہیں تھی اور دریا میں پانی کا نام و نشان نہیں ھوتا تھا۔ ان حالات میں زمین دانه اگلنے کے قابل ھی نہیں رھتی تھی۔ ھمارے بزرگوں کو وہ دن غالباً یاد ھوں‌گے...“

”ھاں کیوں نه یاد ھوں‌گے!“

”سن ستره ھی کی مثال سامنے ھے۔ افوہ! کیسا قحط پڑا تھا!“

نوجوان چنے جاتے تھے۔ وہ ھتھیاروں سے لیس ھوکر دن رات بڑی ھوشیاری سے جیسے کسی سونے کے خزانے پر پہرا دے رھے ھوں، اس بات پر نگاہ رکھتے تھے کہ کسی بھی نالی میں طےشدہ مقدار سے زیادہ پانی نہ جانے پائے۔ اور کچھ دوسرے لوگ بھی اپنی مرضی سے ان پہرےداروں کا ھاتھ بٹاتے رھتے تھے۔ لوگ نالیوں میں بہنےوالے پانی کی آواز کو بھی کان لگاکر سنتے رھتے تھے۔ اگر کسی نالی میں پانی کی آواز ذرا سی اونچی معلوم ھوتی تو فوراً یہ کہتے ھوئے شور مچانے لگتے کہ تمہاری نالی میں پانی زیادہ ھے اور ھماری نالی میں کم ھے۔ لوگو آؤ، ھم کو لوٹ رھے ھیں! بس پھر کیا تھا، ھاتھا پائی شروع ھو جاتی۔ میرآب لوگوں میں سے کچھ افراد طاقتور اور دلیر ھونے کے علاوہ بہت چالاک بھی ھوا کرتے تھے۔ وہ دوسروں کی نالیوں کے دھانوں پر چپکے سے ڈھیلے پتھر ڈال دیتے تھے اور جب اس کا انکشاف ھوتا تو لڑائی شروع ھو جاتی، ھتھیار چل جاتے، لوگوں کا خون بہنے لگتا۔ دراصل لوگوں کو خون کی اتنی فکر نہیں رھتی تھی جتنی پانی کی۔ بعض اوقات تو ان نالیوں میں پانی نہیں خون ھی بہتا تھا۔ یہی وجہ ھے کہ وہ جگہ ابھی تک "خونیں باندھ" کے نام سے مشہور ھے۔"

"ارے خونیں یہی ایک باندھ تھوڑی ھے!" کسی نے لقمہ دیا۔

"ارے ھماری سرزمین پر تو خونیں باندھ اتنے ھیں کہ حساب لگانا ھی مشکل ھے!"

باتوں کی یاد دلا دینا بہت مناسب ہوگا" کسی نے تائید کی۔

"اچھی بات ہے۔ میں سناتا ہوں" آرتیق آغا نے کہا۔ "پانی کی خاطر نخلستان اہال میں کیسے کیسے لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے، وہ میں آپ لوگوں کو سناتا ہوں۔ اس نخلستان میں زندگی کا سارا دار و مدار ایک چھوٹے سے نالے پر تھا جو پہاڑ سے آتا تھا۔ اس چھوٹے سے نالے کی آٹھ بہت ہی چھوٹی چھوٹی نالیاں بن جاتی تھیں۔ یہ جگہ آٹھ نالیاں ہی کہلاتی تھی۔ یہ آٹھ نالیاں آٹھ مواضعات کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں۔ ان مواضعات کے لوگوں میں ہمیشہ لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ نالی میں پانی کی دھار اتنی پتلی ہوتی تھی کہ اسے کسی چائےدانی کی ٹونٹی سے گرنےوالی چائے کی دھار ہی سمجھئے۔ ہر نالی کے پاس لوگوں کی خاصی لمبی قطار بنی رہتی تھی۔ ہر آدمی کو پانی بھرنے کے لئے چند ہی منٹ دئے جاتے تھے۔ وہ پل بھر زیادہ وقت لے لیتا تو سخت جھگڑا شروع ہو جاتا تھا کیونکہ اس پل بھر میں وہ آدمی پانی کی کچھ زیادہ ہی بوندیں لے لیتا اور کوئی دوسرا ان قیمتی بوندوں سے محروم ہو جاتا اور پانی کی کچھ زیادہ بوندوں سے کچھ زیادہ خربوزے، کچھ زیادہ انگور وغیرہ پیدا ہو سکتے تھے۔

جس جگہ یہ آٹھوں نالیاں بنتی تھیں وہاں آٹھ آدمی، آٹھ میرآب دن رات پہرا دیتے رہتے تھے۔ یعنی ہر ایک گاؤں کا ایک آدمی وہاں تعینات رہتا تھا۔ اس کام کے لئے گاؤں کے سب سے طاقتور، دلیر اور پھرتیلے

ضرورت تھی اور اسے بھی یہ فکر ہوئی تھی کہ کاش آمودریا کے پانی کو ترکمانستان کے ریگزاروں تک پہنچایا جائے۔ اس بات پر سائنس‌دانوں نے بھی دماغ سوزی کی، انجینیروں نے بھی خوب سر کھپایا۔ انہوں نے ریگستان کو چھان مارا، کتنے ھی الاؤ جلائے اور کتنی ھی راکھ یہاں چھوڑ گئے۔ انہوں نے خوب تحقیق و تفتیش کرکے سب کچھ اچھی طرح ناپ تول کر، سوچ سمجھ کے منصوبے تیار کئے۔ اس زمانے کے علم و آگہی کے پیش‌نظر وہ منصوبے بہت ھی عمدہ تھے۔ لیکن وہ تمام منصوبے یوں ھی کاغذ ھی پر رہ گئے۔ اس زبردست کام کو ھاتھ میں لیتے ہوئے زارشاھی حکومت کی بھی آنتیں نکل آئیں۔ ویسے ٹکنالوجی بھی تو ان دنوں ایسی نہیں تھی جیسی کہ آج ھے۔ لیکن جیسا کہ کہا جاتا ھے، کوئی بھی محنت اکارت نہیں جاتی۔ جو چل پڑا ھے وہ چاھے جلدی چاھے دیر میں اپنی منزل پر ضرور پہنچ جائےگا۔ جب ھمارے سائنس‌داں اور انجینیر لوگ اس نہر عظیم کی تعمیر کی بات لےکر بیٹھے تو وہ پرانے منصوبے اور نقشے بھی کارآمد ثابت ہوئے۔ تو دوستو! آئیے ھم ان تمام لوگوں کو خراج تحسین پیش کریں جنہوں نے ھماری دھرتی کو سیراب کرنے کی فکر کی ھے، جنھوں نے ھماری سرزمین کو سرسبز و شاداب بنانے کی خاطر محنت کی ھے اور اپنا خون پسینہ ایک کیا ھے۔ ھم ان کے عظیم کارنامے کے لئے ان کے سامنے سر جھکاتے ھیں!"

لوگ ان الفاظ کی تائید میں زور زور سے تالیاں

"اور خونیں کنوئیں بھی تو ھیں" کسی نے کہا۔
"ھاں ٹھیک ھے" آرتیق آغا نے کہا۔ اور پھر انھوں نے کچھ حسرت بھرے جوش کے ساتھ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا: "اور ھماری یہ زمین تو بڑی زرخیز ھے!.. اسی لئے تو یہاں یہ مقولہ مشہور ھوا ھے کہ عصا گاڑ کے تھوک دے اور یقین کر، ھرا نہ ھو جائے تو میرے سر! ھاں ھمارے یہاں زمین اتنی زرخیز ھے کہ اس میں کوئی سوکھی لکڑی بھی گاڑ دی جائے تو شاداب ھو جائے!.. بشرطیکہ اس کو پانی ملے۔ پانی ھی پر سب کچھ منحصر ھے" آرتیق آغا نے ایک گہری سانس لی۔ "پانی ھو تو یہ زمین جنت بن جائے، نہیں تو یہ جہنم ھی جہنم ھے۔ پانی سے زندگی میں رونق آتی ھے اور بغیر پانی کے زندگی مرجھا جاتی ھے۔ ھمارے لئے تو پانی ھمیشہ ایک ایسی سکھ کی چڑیا ھی بنا رھا ھے جس کو پکڑنا تو دور رھا، ھاتھ سے چھونا بھی ناممکن ھو۔ اگر وہ کبھی کسی طرح ھاتھ آ بھی جاتی تو زیادہ دیر نہ رہ پاتی، دوبارہ پھر سے اڑ کے کہیں غائب ھو جاتی! اور اب تو انتظار کی گھڑیاں ختم ھونے ھی والی ھیں۔ جلد ھی وہ چڑیا ھمارے ھاتھ آ جائے گی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ھوں ھمارے عوام جو ھمیشہ سے پانی کا خواب دیکھتے آئے ھیں، حتی‌الامکان کوشاں رھے ھیں کہ کہیں سے پانی حاصل کرکے اپنے کھیتوں کو سیراب کریں۔ لیکن انقلاب سے پہلے ان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ منزل مقصود پر پہنچتے۔ یہاں یہ بھی بتا دینا مناسب ھوگا کہ زارشاھی حکومت کو کپاس کی بہت

کہتا ہے کہ سائنس‌دانوں نے ایک ایک بات کا خیال رکھا ہے۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ پانی آنے پر ریت پکی ہو جائے گی، جم جائے گی۔"

"ہاں بالکل ٹھیک!" پھر کوئی اونچی آواز میں بول اٹھا۔ "لوگوں کو یہ کبھی کا معلوم ہو چکا ہے۔ کوئی خشک ریت پر چلتا ہے تو پاؤں تقریباً گھٹنوں تک ریت میں دھنس دھنس جاتے ہیں اور وہی ریت بارش سے بھیگ جاتی ہے تو چلنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے، جیسے کوئی پکی سڑک ہو۔"

"ہاں ٹھیک ہے" آرتیق آغا نے سر ہلاکر کہا۔ "یہی بات شاید سائنس‌دانوں نے بھی سوچی ہوگی۔ یہی نہیں، انہوں نے دوسرے تمام مسائل پر بھی اچھی طرح غور کر لیا ہوگا۔ سو ہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے تو اس بات پر غور کرنا بہتر ہوگا کہ اس عظیم پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے‌والوں کی ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔ آئیے ذرا سوچیں کہ ہم اجتماعی اور ریاستی فارموں کے محنت‌کش لوگ اس سلسلے میں کون کون سے ٹھوس اقدامات کر سکتے ہیں؟"

ہر طرف سے لوگوں کی جوشیلی آوازیں سنائی دینے لگیں:

"میں اپنی فارم کی کمائی کا کچھ حصہ اس پروجیکٹ کے لئے دینے کو تیار ہوں۔"

"ضرورت ہوئی تو میں اپنے دسترخوان سے روٹی کا آخری ٹکڑا تک دے سکتا ہوں!"

بجانے لگے۔ جب تالیوں کی گونج تھم گئی تو آرتیق آغا پھر بولنے لگے:

"تو دوستو! ھمارے یہاں پانی کی قلت ھے۔ ھمیں پانی کی اشد ضرورت ھے۔ اسی لئے نہر عظیم کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا ھے۔"

"اس نہر کی تعمیر کہیں فضول تو نہیں ھے؟" کسی نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"فضول؟ وہ کیسے؟" آرتیق آغا نے تیوریاں چڑھاتے ھوئے پوچھا۔

"ایسے کہ وہ تو ریگستان میں سے ھوکر آئے گی نا؟ اسی لئے لوگ کہتے ھیں کہ سارا پانی ریت میں جذب ھو جائے گا اور خود نہر بھی ریت سے پٹ جائے گی۔"

آرتیق آغا کو یاد آ گیا کہ کچھ ھی دن پہلے خود انھوں نے اسی مسئلے پر اپنے بیٹے بابالی سے بحث کی تھی۔ سو انھوں نے جواب میں کہا:

"ویسے تو یہ شبہ بےسبب نہیں ھے۔ نہر کا پہلا حصہ کوئی چار سو کلومیٹر لمبا ھوگا اور اس میں سے آدھے سے زیادہ حصہ ریگستان میں بنے گا جہاں ریت رینگتی اڑتی رھتی ھے۔ اور جیسا کہ آپ سب جانتے ھیں ریگستان سے ھنسی مذاق کرنے کا سوال ھی نہیں اٹھتا۔ لیکن ایک تو یہ مقولہ کہ جو چڑیوں سے ڈرے وہ باجرہ کیوں اگائے۔ پھر یہ بات بھی ھے کہ جن لوگوں نے اس نہر عظیم کا نقشہ تیار کیا ھے انھوں نے تو اس مسئلے پر ھم سے کچھ زیادہ ھی غور کیا ھوگا۔ میرا بیٹا

آرتیق آغا! لیکن پهلے یه اپنے عوض کسی کو کام سکھاکر تیار تو کر دیں۔ فارم میں بھی ڈرائیوروں کی اتنی ھی ضرورت ھے جتنی تعمیراتی پروجیکٹ پر۔"

"میرے خیال میں اس بات کو ذرا دوسرے ڈھنگ سے سوچنا چاھئے یعنی یوں کہنا چاھئے که تعمیراتی پروجیکٹ پر ڈرائیوروں کی اتنی ھی ضرورت ھے جتنی فارم پر! واہ، ترخان ماوی! تم سے تو مجھے یه امید نه تھی۔ تم ایک سندیافته ماھر زراعت ھو اور اگر تمھیں بھی اس پروجیکٹ کی اھمیت کا احساس نہیں ھے تو ان دوسرے چیرمینوں سے کیا امید رکھی جا سکتی ھے جنھوں نے اس قسم کی تعلیم ھی نہیں پائی؟"

"ارے یه کیا کہه رھے ھیں؟ مجھے احساس نہیں؟" ترخان ناراض ھو گئے۔ "بخوبی احساس ھے۔"

"ھاں تمھیں احساس تو ھے لیکن صرف ذھنی طور پر۔ تم اس کی اھمیت کا احساس دل سے کرو، اپنے سارے تن بدن سے کرو!.. ھاں ھاں یہی بات ھے محترم چیرمین۔ تم نہرعظیم کو سچے دل سے اپنا لو، اس کو اپنے دل میں بٹھا لو۔ تو پھر اپنے فارم کے مفاد کو پروجیکٹ کے مفاد پر ترجیح نه دوگے!"

"ھمارا بھی تو ایک منصوبه ھے آرتیق آغا! اور اس منصوبے کو بہرحال پورا کرنا ھے!" ترخان نے اپنی صفائی دی۔

"تم بات کو ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھو نا۔ ذرا زیادہ سنجیدگی سے غور کرو نا که تمھارا ایک

"اور میں تو خود ھی اس پروجیکٹ میں جاکر دن رات کام کرنے کو تیار ھوں۔"

اتنے میں ھال کے بیچوں بیچ انام نام کا ایک نوجوان جو اجتماعی فارم میں ڈرائیور تھا، اٹھ کھڑا ھوا اور اس نے آرتیق آغا سے کہا:

"آرتیق آغا! میں آپ سے وعدہ کر چکا ھوں کہ نہر پر جاکر کام کروں گا۔ میرا یہ وعدہ پکا ھے اور میں اس سلسلے میں فارم کے چیرمین کو درخواست بھی دے چکا ھوں۔ لیکن میری اس درخواست کا تو ابھی تک کوئی جواب ھی نہیں ملا۔"

"اور تم نے چیرمین سے اصرار کیا کہ نہیں؟" آرتیق آغا نے پوچھا۔

"واہ! اصرار کیوں نہ کرتا؟ ضرور کیا ھے۔ لیکن چیرمین کوئی جواب ھی نہیں دے رھے ھیں۔ اور ادھر میں نے اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا ھے۔"

آرتیق آغا نے ذرا تیکھی نظروں سے چیرمین کی طرف دیکھا اور کہا:

"ارے یہ کیا بات ھے، ترخان ماوی؟ تمھارے فارم کے لوگ اپنی مرضی سے ایک نیک کام کے لئے کمر باندھتے ھیں اور تم ان کے راستے میں روڑے اٹکاتے ھو؟"

ترخان‌ماوی کھڑے ھو گئے اور دونوں ھاتھوں کی ھتھیلیوں کو سینے پر رکھ‌کر کہا:

"ھم ان کو اپنے یہاں سے چھٹی دے دیں گے

"ضرورت پڑی تو ایسے دس کارکنوں کو بھیجنا پڑےگا۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟" آرتیق آغا نے ھال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔

پروجیکٹ کے رحمیت سیکٹر کے لئے ٹرینوں کے ذریعے بڑی تیزرفتاری سے سامان پہنچ رہا تھا۔ بابالی کو اس سیکٹر کا انچارج مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اس سامان کو ٹرینوں سے اتروا کر مختلف جگھوں پر پہنچانے میں مصروف تھا۔ پہلے وہ اس کام کو بہت دشوار خیال کرکے کچھ گھبرا گیا تھا لیکن کام اندازے سے کافی آسان نکلا۔ اس سلسلے میں ایوان پیترووچ نے اس کا بہت ھاتھ بٹایا۔ وہ سیکٹر کے انجینیر ہونے کی وجہ سے اس کام کے عادی تھے اور بابالی کا سہارا پاکر زیادہ آرام محسوس کر رہے تھے۔

بابالی نے سوچا تھا کہ سیکٹر میں کارکنوں کا مسئلہ سب سے پیچیدہ ہوگا۔ اس کا خیال صحیح ثابت ھوا۔

شروع شروع میں کسی بڑے تعمیراتی پروجیکٹ کی حالت کسی بڑے ریلوے اسٹیشن جیسی ہوتی ھے: کوئی آ رہا ھے، کوئی جا رہا ھے، بہت سے لوگ اپنا سامان باندھے بیٹھے ھیں اور نہ جانے کب چلے جائیں... اور ان میں ہر قسم کے لوگ ھیں۔

رحمیت سیکٹر کا بھی یہی حال تھا۔ یہاں بھی لوگ ابھی اچھی طرح نہیں ٹک پائے تھے۔

اجتماعی فارم کیا چیز ہے اور نہر کا تعمیراتی پروجیکٹ کیا چیز ہے۔"

"ارے آرتیق آغا! آپ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں نہ کھڑا کیجئیے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں تو اس کے برعکس یہ کہتا ہوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تم آج پروجیکٹ‌والوں کا ہاتھ بٹاؤگے تو پانی زیادہ جلدی تمہارے فارم میں آ جائیگا اور تم اپنے منصوبے سے دوگنا تگنا زیادہ کام پورا کر لوگے! آخر یہ بات میں تم کو کیوں سمجھا رہا ہوں؟ تم کوئی بچے تھوڑی ہو۔ تمہارے بھی دماغ ہے۔"

ترخان ماوی نے بات کو تسلیم کرنے کے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا:

"میں ہار گیا آرتیق آغا، میں ہار گیا! آپ نے بےشک صحیح فرمایا... میں نے شاید واقعی ذرا تنگ‌نظری سے کام لیا ہے۔ نہر تو دور ہے۔ اور فارم یہاں ہے!" انہوں نے ہتھیلی سے اپنی گردن کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اس پر لوگ ہنسنے لگے۔ ترخان‌ماوی کچھ ناراض ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا:

"ارے میں کوئی اعتراض کر رہا ہوں کیا؟ انام‌چاری پروجیکٹ پر جانا چاہتے ہیں تو خوشی سے چلے جائیں۔ چاہے آج ہی چلے جائیں۔ بھلا ایک کارکن کے چلے جانے سے ہمارا کیا بگڑ جائیگا؟"

صورت، ھٹا کٹا اور گول مٹول سا تھا بالکل اس کندے کی مانند جسے اوکھلی بنانے کے لئے کاٹا گیا ھو۔ اس کی آنکھوں میں کچھ غصے کی جھلک تھی اور چہرے کو دیکھکر ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے قرض کا تقاضا کرنے آیا ھو۔

بابالی نے ایک مضحکہ آمیز اشتیاق کے ساتھ اس پر نظر ڈالی اور پوچھا:

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ھے تو آپ کامریڈ والکوف ھیں نا؟"

"ھاں والکوف" نوجوان نے بےدلی سے جواب دیا۔

"آئیے، تشریف رکھئے" بابالی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نوجوان نے اپنے سر کو جھٹکا دے کر سامنے کے ٹیڑھے کٹے ھوئے بالوں کو جو کسی بچھیڑے کی کٹی ھوئی دم جیسے تھے، پیشانی سے ھٹایا اور اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکالتا ھوا بولا:

"میں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا ھوں، کامریڈ سربراہ۔"

"ویسے ذرا دیر بیٹھنے میں ھرج بھی کیا ھے؟ کہتے ھیں نا، پاؤں میں حقیقت نہیں ھے۔"

بابالی نے دوبارہ بڑی نرمی سے کرسی پیش کی۔ نوجوان بڑی بےدلی سے کرسی کے ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ سربراہ کی عنایت اور مہربانی دیکھکر اسے شاید کچھ شرم سی آ رھی تھی... اور بابالی نے کسی بات کی پروا کئے بغیر اسی نرمی سے پوچھا:

آنےوالوں میں زیادہ‌تر ایسے لوگ تھے جو اپنے ضمیر کی آواز پر بڑے نیک مقاصد لےکے آئے تھے۔ یہ لوگ پروجیکٹ کے مفاد کو خود اپنا مفاد سمجھتے اُور جی جان سے کام کر رہے تھے... یہ سب بابالی کو فوراً ہی معلوم ہو گیا۔

سیکٹر کو مستقل کارکنوں کی ضرورت تھی، خاص طور پر ایسے کارکنوں کی جو نہر کی کھدائی سے متعلق مختلف مشینوں مثلاً بلڈوزر، ایکسکویٹر اور اسکریپر سے کام لے سکیں۔

اور بابالی کو ایسے تربیت‌یافتہ کارکنوں کی خدمات حاصل کرنے پر خوب سر کھپانا پڑ رہا تھا۔

عشق‌آباد اور چارجو میں مشین ڈرائیوروں کے لئے ایک تربیتی مرکز قائم کیا گیا تھا۔ یہاں سے مشین ڈرائیوروں کے پہلے گروپ کی تربیت عنقریب مکمل ہونےوالی تھی۔

ان لوگوں میں سے کچھ کو بابالی کے سیکٹر میں بھی ضرور آنا تھا اور جو بابالی کے لئے بڑی پرمسرت بات ہوتی لیکن یہ تو مستقبل کی بات تھی۔ یہاں تو اس قسم کے کارکنوں کی اور پروجیکٹ پر ان مشین ڈرائیوروں کی آج ہی، فوراً ہی ضرورت تھی!..

ایک روز بابالی اپنے دفتر میں بیٹھا ایسے ہی کارکنوں کے مسئلے پر سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک نوجوان اندر آیا جس سے بابالی کی جان پہچان ہو چکی تھی۔ دیکھنے میں کافی قبول

"خوب۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت کچھ خالی ہوں۔ سو ہم آپ دونوں کچھ دیر بیٹھ‌کر باتیں کر لیں گے..."

"کیا باتیں کرنی ہیں؟"

"یونہی کچھ باتیں ہیں" یہ کہہ‌کر بابالی نے ہتھیلی سے اپنا منھ پونچھا اور کچھ طنز اور کچھ ترحم کے ساتھ نوجوان کو اس طرح تکنے لگا جیسے اس کے دل کی بات بھانپنا چاھتا ہو۔ پھر اس نے نوجوان سے کہا:

"تم تو جانتے ھی ہو کہ آج‌کل یہاں کام ھی کام ھے، ھمارا یہ پروجیکٹ تنظیم و تشکیل کے پرمشقت دور سے گزر رھا ھے اور کارکن کا اپنا ایک خاص مقام ھے۔"

"مجھے اس سے کیا سروکار؟"

"آپ کا کوئی سروکار نہیں کیا؟ آپ اس قدر جاھل اور کورمغز ہیں کیا؟.. نہیں، اس کا مجھے یقین نہیں آتا، کامریڈ والکوف۔ ایسا نہیں ہو سکتا... آپ کو کسی بات کی شکایت تو نہیں ھے؟ تنخواہ تو کم نہیں ھے؟"

"تنخواہ کی شکایت کرنا تو گناہ ہوگا۔"

"کھانا اچھا نہیں ملتا کیا؟"

"مجھے کھانے کی پروا نہیں۔ میں پیٹ کا غلام نہیں ہوں۔"

"تو پھر آپ نے یہاں سے چلے جانے کی اتنی جلدی کیوں مچا رکھی ھے؟ یہ تو ایک عظیم‌الشان تعمیراتی

"کہئے کامریڈ والکوف، کیا حال چال ہیں؟ کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ارے کیا کہنا" نوجوان نے مایوسی کے انداز میں ہاتھ جھٹک دیا۔ "کام بس ایسا ہی ویسا چل رہا ہے۔ اور زندگانی تو اس گاڑی کی طرح چرمرائے جا رہی ہے جس کے پہیوں میں تیل نہ ہو۔"

"کیوں؟"

"یہ کہانی تو بہت لمبی ہے۔ اور میں اس کہانی کو سنانے کے لئے یہاں نہیں آیا ہوں۔ آپ یہ بتائیے کہ یہ خزانچی لوگ میرا حساب کتاب کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ مجھے جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ تو کر چکا ہوں۔ درخواست دئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔"

بابالی اس فائل کو نکال کر دیکھنے لگا جس میں پروجیکٹ سے مستعفی ہونےوالوں کی درخواستیں رکھی تھیں۔ اس نے فائل کی ورق گردانی کرکے کہا:

"ہاں ٹھیک ہے۔ پندرہ دن گزر چکے ہیں۔"

"پھر یہ کیسی بیہودہ بات ہے..." نوجوان نے غصے سے کہا لیکن بابالی نے اس کو نرمی سے ٹوک دیا:

"ذرا ٹھہریے کامریڈ والکوف، تیزی نہ کیجئے۔ آپ کی درخواست کو میں نے ہی روک رکھا تھا۔"

"آخر کیوں؟"

"میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو کوئی خاص جلدی تو نہیں ہے؟"

"ن۔ ن۔ نہیں تو..."

"بس میں ابھی اور جینا چاھتا ھوں۔ اور یہاں تو جینا دوبھر ھے۔ روزانہ دس کلو دھول اندر جاتی ھے اور پانچ کلو پانی باھر آتا ھے۔ یہ بھی کوئی جینا ھوا؟"

"یعنی مطلب یہ ھے کہ آپ مشکلوں سے گھبرا گئے؟"

"میں نے تو کہہ دیا کہ جینا چاھتا ھوں۔"

"ٹھیک ھے۔ شوق سے زندہ رھئے... میرا خیال تھا کہ آپ سے ابھی امید وابستہ کی جا سکتی ھے۔ لیکن آپ... خیر، کوئی بات نہیں۔ جنہیں مشکلات کا سامنا کرتے ڈر لگتا ھو وہ شوق سے جا سکتے ھیں۔ ھم ان کے بغیر ھی کسی طرح کام چلا لیں گے۔ ایسے لوگوں کے لئے راستہ بالکل کھلا ھوا ھے۔"

بابالی نے فائل سے والکوف کی درخواست نکالی اور اسے منظور کرتے ھوئے غصے سے دستخط کر دئے۔ والکوف نے کاغذ کو لینے کے لئے ھاتھ بڑھایا لیکن بابالی نے نہیں دیا۔ اس نے نوجوان سے پوچھا:

"آپ اسکریپر چلاتے ھیں نا، کامریڈ والکوف؟"

"ھاں... اسکریپر چلاتا ھوں" والکوف نے درشتی سے جواب دیا۔

"اور آپ نے اپنا اسکریپر کہاں چھوڑ دیا ھے؟"

"وھیں جہاں کام کر رھا تھا۔ اور کیا؟"

بابالی نے میز کے سرے پر لگے ھوئے بٹن کو دباکر گھنٹی بجائی اور سکریٹری لڑکی اندر آئی تو اس سے کہا:

پروجیکٹ ہے۔ اس کا نام تو ہمارے ملک کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائےگا اور ساتھ ہی ساتھ جتنے لوگ اس کار عظیم میں شریک ہیں یا ہوں‌گے ان کے بھی نام روشن ہوں‌گے۔"

"مجھے نام اور شہرت کی تلاش نہیں ہے۔"

"تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے! روسی شاعر گوسیف نے کہا ہے نا کہ "کام کئے جاؤ، شہرت خود ہی مل جائےگی۔ شرط یہ ہے کہ کام شہرت کے لائق ہو، بس یہی بات ہے۔ اچھا نام اور شہرت کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے، تنخواہ کی بات ٹھیک ہے، کھانے کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ تو پھر وہ کون‌سی بات ہے جس کی وجہ سے آپ یہاں سے بھاگ رہے ہیں؟"

"ارے بھاگنے کی کیا بات ہے! جا رہا ہوں بس۔"

"اس قسم کے پروجیکٹوں کو چھوڑکر جانے کا مطلب ہوتا ہے بھاگنا، فرار کرنا۔"

"ارے چھوڑیے بھی یہ باتیں، کامریڈ سربراہ" نوجوان نے غصہ بھرے جوش سے کہا اور آگے کے تراشے ہوئے بال پھر اس کے ماتھے پر آ گئے۔ اس بار اس نے ان بالوں کو پیچھے نہ ہٹایا بلکہ ہاتھ سے سہلانے لگا۔ "اس قسم کے شاندار الفاظ سے میں متاثر ہونےوالا نہیں ہوں۔ اگر مجھے یہ جگہ پسند نہیں آئی ہے تو مجھے جانے سے کون روک سکتا ہے؟ اس کا مجھے پورا حق ہے۔"

"آخر آپ کو کیا پسند نہیں آیا؟"

کی بیچینی کی کوئی وجه ضرور تھی۔ اسی لئے وہ بغلیں جھانکتے ہوئے اپنی صفائی دینے لگا:

"کامریڈ سربراہ!.. مشینیں تو سبھی لوگوں کی خراب ہیں۔ مانا که میری اسکریپر کے کچھ پرزے ٹوٹ گئے ہیں۔ اور اس کا چھرا بھی کند ہو گیا ہے، کچھ آری سا بن گیا ہے۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"تو پھر آپ کے خیال میں قصور کس کا ہے؟"

"ریت کا ہے! اور کس کا۔ لعنت ہو اس پر!.. اور پھر زمین کہیں کہیں ایسی ہوتی ہے که چھرے کو کسی بھیڑ کی پتلی نرم ہڈی کی طرح چبا ڈالتی ہے!"

"یه سب میکینک سے کہئے۔ اور جو خرابیاں ہوں وہ سب دکھا دیجئے۔ اور یه خرابیاں کیسے پیدا ہوئی ہیں یه بھی بتا دیجئے۔ از راہ کرم اب میرا اور وقت نه لیجئے۔ مجھے بہت سے دوسرے کام ہیں۔"

"کامریڈ سربراہ!.."

"میں نے کہه دیا نا، میں مصروف ہوں، از راہ کرم میرے کام میں خلل نه ڈالئیے۔"

والکوف اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر اپنی جگه سے تھوڑا سا اٹھا اور دھمکانے کے انداز میں کہا:

"تو مطلب یه ہے که آپ کے لئے کوئی قانون ہی نہیں ہے؟"

"میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں که ہمارے قوانین ایمانداری سے محنت کرنےوالوں کے حق میں ہیں،

"آپ ذرا میکینک کو تلاش کرکے ان سے کہئے کہ کامریڈ والکوف کی اسکریپر کو دیکھ بھال کر قبول کر لیں۔"

نوجوان بوکھلا سا گیا۔ اس نے کہا:

"کیوں؟ کیا ضرورت ھے... میکینک کی؟ اسکریپر تو بالکل ٹھیک ٹھاک ھے۔"

"تب تو آپ کو پریشان ھونے کی کوئی ضرورت نہیں" بابالی نے کہا۔

بابالی اب اس نوجوان کی نبض کو پکڑ چکا تھا اس لئے اس کی گھبراھٹ دیکھ‌کر اسے زیادہ تعجب نہیں ھوا۔

موٹر ڈرائیوروں اور مشین ڈرائیوروں میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کے لئے یہ تعمیراتی پروجیکٹ چند روز کے ایک اتفاقیہ پڑاؤ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ جب یہاں سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگتے تو اپنی موٹروں اور مشینوں سے بےفکری برتتے تھے۔ نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ وہ جلد ھی خراب ھو جاتی تھیں۔

یہ والکوف بھی غالباً انہیں غیرمستقل لوگوں میں سے تھا۔ اسی لئے بابالی نے مناسب سمجھا کہ وہ اس کی اسکریپر کو ضابطے کے مطابق میکینک کے سپرد کرے۔ اسے اب والکوف سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور اس کے چہرے سے بےگانگی اور فکر ٹپکنے لگی تھی۔

والکوف شاید یوں ھی نہیں گھبرا رہا تھا۔ اس

بابالی نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"سیرگئی گیراسموووچ! آپ نے شاید یہ مقولہ سنا ہوگا کہ لاغر کتا لاغر کتے ہی کی دم چاٹتا ہے... کچھ ایسی ہی بات ہو رہی ہے۔ خود مجھے بھی تو مشین ڈرائیوروں کی ضرورت ہے۔ مجھے بھی ان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کرامیت‌نیاز والوں کو بلکہ ان سے بھی زیادہ!.. میں نے مانا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے لیکن کیا کروں، مجبور ہوں۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کوئی لاکھ اچھلے، اپنے آپ سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ اور پھر یہ کہاوت بھی ہے کہ خارش کا مریض کوئی دوا پاتا ہے تو اس سے سب سے پہلے اپنے سر کی مالش کرتا ہے۔ اس وقت اسکریپر چلانےوالے دو تین آدمی تو خود میرے لئے بھی بڑے کام کے ثابت ہوتے۔ کاش کم از کم ایک آدمی ہی ایسا مل جاتا! سرگئی گیراسموووچ، یہاں بھی حالت بڑی سنگین ہے۔ کارکنوں کی سخت کمی ہے!.."

بابالی نے ریسیور رکھ دیا اور خیالوں میں گم ہو گیا۔ جب اس نے والکوف سے کہا تھا کہ سیکٹر میں ہر ایک کارکن کا اپنا ایک خاص مقام ہے تو کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ والکوف نے تو پروجیکٹ سے بھاگنے کی ٹھانی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ایک ایسے آدمی سے جدا ہونے پر کڑھنے، افسوس کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس کے چلے جانے سے ایک اہم‌ترین جگہ پر کام رک جائےگا۔ اسکریپر ہی بےکار ہو تو وہاں ایکسکویٹر کے لئے بھی

لفنگوں اور بےفکروں کے حق میں نہیں ہیں۔ اور اب بس کیجئے، والکوف! خوب باتیں کر لیں ہم نے" یہ کہہ کے اس نے میز پر اس زور سے مکا مارا کہ فائل کے پاس پڑی ہوئی پنسل اچھل کر فرش پر والکوف کے قدموں میں جا گری۔ "آپ ابھی جاکے اپنی اسکریپر کو میکینک کے سپرد کر دیجئے" بابالی نے سختی سے کہا۔ "اگر وہ خراب ہے تو آپ کو اس کی مرمت کرنی پڑےگی۔ جب یہ سب ہو جائےگا تب ہی میں آپ کی درخواست کو اکاؤنٹنٹ کے حوالے کروں گا۔ جائیے!.."

نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اس کا ایک پاؤں فرش پر پڑی ہوئی پنسل پر پڑا اور پنسل لانگ بوٹ تلے چرمرا گئی۔ نوجوان کچھ کہنے کو ہوا لیکن بابالی کی نفرت بھری قہرآلود نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور اس کی بات منھ ہی منھ میں رہ گئی۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اتنے میں اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بابالی نے ریسیور اٹھایا۔ نہرعظیم سے متعلق پروجیکٹ کے چیف ڈائرکٹر کی آواز سنائی دی۔ چیف ڈائرکٹر نے کہا کہ وہ شہر مری سے بول رہا ہے، ابھی ابھی کرامیت‌نیاز سیکٹر کے دورے سے واپس ہوا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں بل‌ڈوزر اور اسکریپر چلانےوالوں کی سخت کمی ہے۔ اس نے بابالی سے گزارش کی بلکہ ہدایت کی کہ وہ تین چار مشین ڈرائیوروں کو جلد سے جلد اس علاقے میں بھیج دے۔

یہی حال شاید تمہارا بھی ھے۔ تم جو "لقمہ! لقمہ!" کہہ‌کر کڑھتے اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہتے ہو، اس کی بھی یہی وجہ ھے کہ تمہارا کام بہت آسان ھے۔"

"آسان ھے؟" نوری نے بڑی برھمی سے کہا۔ "تم اسے آسان کہتے ہو؟ نہ دن کو آرام ھے نہ رات کو چین۔ لق و دق صحرا میں اپنے چیف کو لئے لئے پھرتا ھوں، کسی بنے بنائے راستے کا نام و نشان نہیں۔ کہیں ایک بوند بھی پانی نہیں ملتا۔ منھ میں اوس کا قطرہ بھی نہیں پہنچتا۔ گاڑی خراب ہو گئی تو گھنٹوں اس کے نیچے پڑا رھا۔ یہ سب آسان ھے کیا؟"

بابالی نے ھمدردی کے انداز میں زبان سے ٹخ ٹخ کی آواز نکالتے ھوئے کہا: "ھائے – ھائے! بیچارے نوری! ھاں تمہیں تو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ھیں۔ سنو، میں تمہیں کوئی دوسرا، ذرا آسان سا کام دے دوں تو کیسا رھے؟ نہیں تو مجھے ڈر ھے کہ کہیں گاڑی چلاتے چلاتے تمہاری آنتیں ھی نہ نکل آئیں یا پھر خدا نہ کرے کہ تم بھوکے مر ھی جاؤ۔"

"واہ! کہیں مجھے باورچی بنانے کا ارادہ تو نہیں ھے تمہارا؟"

"نہیں تو۔ باورچی کا کام بھی کوئی حلوا پوری والی بات نہیں ھے۔ بس اوپر سے دیکھنے میں یوں لگتا ھے کہ یہ کام جیسا کہ کہتے ھیں کچھ بے‌گرد و غبار سا ھے۔"

کوئی کام نہیں ھے... اور کسی دوسرے اسکریپر ڈرائیور کو کہاں سے لایا جائے!

اچانک موٹر ڈرائیور نوری کی آواز بابالی کو جاں‌لیوا تفکرات کے عالم سے لوٹا لائی جیسے وہ گہری نیند سے اچانک جاگ اٹھا ھو۔ نوری نہ جانے کب کمرے میں آکر اس کے سامنے کھڑا ھو گیا تھا۔

"ارے سربراہ! یہ کس بات پر اتنا سر کھپا رھے ھو تم؟" نوری نے پوچھا۔

بابالی نے سر اٹھاکر اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ھوئے کہا:

"ھیں کچھ ایسی ھی باتیں..."

"ارے سربراہ!" نوری نے کہا۔ "تم نے یہ کہاوت سنی ھے نا کہ پیٹ بھرا اور غم گیا۔ اگر ھم ابھی چل‌کر عمدہ سے لقمے* کی ایک ایک پلیٹ پیٹ میں ڈال لیں تو سبھی مسئلوں کا فوراً حل نکل آئے۔"

"میں دیکھتا ھوں کہ تم کو بس پیٹ ھی بھرنے کی پڑی ھوئی ھے..."

"ارے سربراہ! یہ کہاوت کچھ بیجا تھوڑی ھے کہ بھوک لگی اور ھوش اڑا۔"

بابالی نے کچھ سوچتے ھوئے اپنی پیشانی پر ھاتھ پھیرا اور کہا:

"میں ایک بات بتاؤں، نوری؟ کہتے ھیں کہ گدھے کا بوجھ ہلکا ھو تو وہ ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا ھے۔

---

* ایک ترکمانی لذیذ کھانا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تو اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی میرا عضو عضو کانپنے لگتا ہے۔ پھر میرا یہ خیال بھی ہے کہ اسکریپر میرا حکم ماننے پر شاید ہی تیار ہو۔ تم ذرا سوچو نا کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یا اسکریپر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے یا پھر تم کو اپنے وفادار ڈرائیور نوری کا جنازہ اٹھانا پڑے گا۔"

"اسکریپر کے چہرے سے تمہاری زبان کو تھوڑا سا کاٹ دیا جائے تو اچھا ہو!.. اچھا اب چھوڑو بھی یہ بے کار کی باتیں۔ سب طے ہو گیا۔ لاؤ، گاڑی کی چابی مجھے دے دو۔"

نوری نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ جس کی قسمت کھوٹی ہو اس کو اونٹ کے اوپر بھی کتا کاٹ لے گا۔ بے چارہ نوری پیٹ خالی ہونے کی بات زبان پر لایا ہی تھا کہ اس کا گریبان پکڑ لیا گیا!" پھر اس نے رحم بھری نظروں سے بابالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ہائے ہائے، سربراہ! میرے بغیر تم پر جانے کیا بیتے گی۔"

"میری فکر مت کرو۔ موٹر ڈرائیور زیادہ آسانی سے مل جائے گا۔ کیا تم سوچتے ہو کہ تم سے جدا ہونے کا مجھے دکھ نہیں ہو رہا ہے؟ تم کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے تو میرا جگر خون ہوا جا رہا ہے لیکن میں تمہیں بتا دوں، تعمیراتی پروجیکٹ میں ہر پیشے کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ موٹر ڈرائیور بے شک ضروری

"تو پھر ممکن ہے تم مجھے اپنا نائب بنانا چاھتے ہو؟"

"ارے تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ بھلا میں تمہیں یہ سزا کیوں دوں؟ نہیں، نوری‌خان۔ تم تو بھئی... اسکریپر ڈرائیور بنوگے۔"

"میں؟.. اسکریپر ڈرائیور بنوں‌گا؟" نوری پاگل سا ہو اٹھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بڑی بیچینی سے ادھر ادھر دوڑنے لگیں...

"ارے اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟" بابالی نے کہا۔ "یہ کام تو تمہارے لئے بہت ھی مناسب ہے۔"

"سربراہ! خدا کے لئے تم میرے ساتھ ایسا مذاق نہ کیا کرو۔ میرا دل ذرا کمزور ہے۔"

"تمہارا دل تو ھماری "گازیک" کے انجن سے کچھ بھی کم نہیں ہے۔ نہیں نوری، میں مذاق تھوڑی کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی مجھے سیکٹر نمبر تین کے ایک اسکریپر ڈرائیور کو نوکری سے جواب دینا پڑا ہے۔ اس سیکٹر کی بہت زیادہ اھمیت ہے۔ وھاں کسی بھی اسکریپر کو ایک منٹ بھی بےکار نہیں رہنے دیا جا سکتا۔ اور افسوس کی بات ہے کہ تم بھی پچھلے کچھ دنوں سے بےکار سے رہنے لگے ہو۔ ھم یکبارگی دو خرابیوں کو دور کر سکتے ھیں۔ تم اسکریپر کی لگام تھام‌کے اس کو چلنے پر مجبور کروگے اور ساتھ ھی ساتھ پروجیکٹ میں ایک مناسب مقام حاصل کر لوگے۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے سربراہ لیکن اگر میں اور اسکریپر دونوں ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ پائے تو؟

"ارے سربراہ! تم مجھے بےکار ڈرا رہے ہو۔ میں دھول مٹی ہی میں پیدا ہوا اور بڑھا پلا ہوں۔"

"بہت خوب۔ تو تم اسکریپر پر چڑھوگے اور اس سرزمین کو دھول مٹی سے پاک کرکے سرسبز و شاداب بنانے کی خاطر محنت کروگے۔"

نوری بابالی کے سامنے بس یونہی مذاق میں اپنے کو کسی اناڑی، بھولے بھالے آدمی کے روپ میں پیش کر رہا تھا جس کو اسکریپر کے پاس جاتے ہوئے ہی ڈر لگتا ہو۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ جب اس نے پہلی بار اسکریپر کو دیکھا تھا تو حیرت اور ڈر کے مارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتا رہ گیا تھا: واہ! یہ تو کوئی مشین نہیں بلکہ کسی کہانی سے نکلا ہوا بھوت ہے!.. پھر جب اس نے پہلی بار اسے چلانے کی کوشش کی تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ "بھوت" اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ دراصل کسی تجربےکار موٹر ڈرائیور کے لئے اسکریپر یا بلڈوزر کو چلانا کوئی خاص مشکل کام نہیں ہوتا۔ تو نوری نے اس مسئلے پر جو بھی بحث اور کھینچاتانی کی وہ محض مذاق تھی۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ تعمیراتی پروجیکٹ میں مشین ڈرائیوروں کی کتنی اہمیت ہے۔ بابالی کے ساتھ رہ‌کر وہ ہر چیز کو اسی کی نظروں سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اور اب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اسکریپر چلاتے ہوئے پروجیکٹ کو کہیں زیادہ فائدہ پہنچا سکے‌گا۔ اسے بابالی اور اپنی جانی پہچانی ہوئی "گازیک" سے جدا ہونے کا بہت دکھ ہو رہا تھا لیکن کیا کرتا۔ بابالی ہی اس سے اسکریپر

آدمی ھے لیکن اسکریپر ڈرائیور تو بہت ھی ضروری ھے! کار چلانےوالے کسی آدمی کی مجھے ضرورت ھے لیکن اسکریپر چلانےوالے آدمی کی ضرورت سارے پروجیکٹ کو ھے! ھمیں تو سب سے پہلے پروجیکٹ کی بات ھی سوچنی ھوگی۔"

"تمہارے اور میرے مفاد کی کوئی اھمیت ھی نہیں ھے کیا؟"

"نوری‌خان! مجھے یقین ھے که تم ایک اعلا درجے کے اسکریپر ڈرائیور بن جاؤگے اور سارے پروجیکٹ میں اپنا نام روشن کروگے!.. اور پھر تنخواہ بھی تو زیادہ ھوگی۔ اسکریپر ڈرائیور، موٹر ڈرائیور سے کوئی تین گنا زیادہ تنخواہ پاتا ھے۔"

"کہیں میں اتنی بھاری رقم کے بوجھ تلے دب کر نه رہ جاؤں..."

"نہیں بھئی، یه بوجھ تم اٹھا لوگے۔"

"اور اگر میں اچھا اسکریپر ڈرائیور نه بن سکا تو؟"

"مجھے تم پر بھروسه ھے، نوری‌خان! عقل، طاقت اور جوش و عمل کی تم میں کوئی کمی نہیں ھے۔ ظاھر ھے که شروع شروع میں تمہیں کافی تکلیف اٹھانی پڑےگی۔ سچ کہا جائے تو اسکریپر ڈرائیور کا کام موٹر ڈرائیور کے کام سے کافی مشکل ھوتا ھے۔ اس میں کوئی شبه نہیں۔ تمہیں دماغ، آنکھیں، ھاتھ، پاؤں سبھی سے ایک ساتھ کام لینا پڑےگا۔ اور پھر دھول مٹی بھی خوب نگلنی پڑےگی..."

لیے رہا ہے۔ وہ شروع شروع میں دو چار روز تمہاری مدد کرے گا۔"

"دوسروں کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں" نوری نے ناک چڑھا کر کہا۔ پھر متفکرانہ انداز میں بھویں سکیڑ کر بولا: "ارے سربراہ، سنو! جب تک کوئی نیا ڈرائیور آئے گا تمہاری "گازیک" کو کون چلائے گا؟"

"کیا کروں، میں خود ہی چلا لوں گا۔"

"شکر ہے اللہ کا۔ اب مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ لیکن یہ بات بھی تو ہے کہ تمہیں کون سا ڈرائیور ملے گا۔ بھلا میں اپنی گاڑی کو کسی اناڑی ڈرائیور کے ہاتھ میں کیسے دے سکتا ہوں؟ وہ تو میری جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے..."

"اب تو اسکریپر ہی کو تمہاری جان کے ساتھ لگنا ہے۔ لیکن پریشان نہ ہو۔ نیا ڈرائیور آئے گا تو میں تم کو بلا لوں گا اور تم اس کا اچھی طرح امتحان لوگے۔"

"بس اب قصہ ختم، سربراہ! بات صاف ہے۔ پوچھنے لائق اب کوئی بات نہیں رہ گئی اور میں سوچتا ہوں کہ اتنا کچھ ہو گیا تو اب عین وقت ہے کہ ذرا ہم چل کر اپنے پیٹ بھر لیں۔"

"ہاں تمہاری بات صحیح ہے۔ چلو نوری خان۔"

بابالی چاہتا تو تھا کہ کھانا طعام خانے ہی میں کھا لیا کرے۔ وہ دو تین بار وہاں گیا بھی لیکن جلد ہی یقین ہو گیا کہ یہاں لوگ ٹھیک طرح سے کھانے بھی نہیں دیں گے۔ لوگ کسی نہ کسی اشد ضروری کام سے

ڈرائیور بننے کے لئے کہہ رہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسا ہونا ہی چاہئے۔

اور نوری اپنی آستینیں چڑھانے لگا جیسے اپنے آئندہ کام کا اندازہ لگا رہا ہو۔

بابالی نے اس کو شبہ بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"ارے تم آستینیں کیوں چڑھا رہے ہو؟ کسی سانڈ کو آختہ کرنا چاہتے ہو کیا؟"

"میں پہلے ہی سے اسکریپر پر چڑھنے کی ذرا مشق کر رہا ہوں۔"

"پانی کو دیکھا نہیں اور ابھی سے پاجامہ اتارنے لگے؟"

"ارے سربراہ! تم اپنے نوری کو جانتے ہی ہو۔ اگر وہ اسکریپر پر چڑھ گیا تو اس پر بیٹھے بیٹھے دن رات ایک کر دےگا!"

"یہ بھی کہہ دو نا کہ تین ہی دنوں میں ساری نہر کھود ڈالوگے۔"

"ساری نہر تو شاید نہ کھود سکوں‌گا لیکن کوشش پوری پوری کروں‌گا۔"

"ہاں مجھے اس کا پورا یقین ہے، نوری خان۔ یقین نہ ہوتا تو میں تمہیں یہ کام سونپتا ہی کیوں۔"

بابالی نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ‌کر نوری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"یہ رقعہ لے جاکر سیکٹر نمبر تین کے میکینک کو دینا۔ وہ اس وقت ایک لفنگے سے اسکریپر کو واپس

محسوس ہو سکتی ہے؟ تم نے پہلوانوں جیسی صحت جو پائی ہے۔"

"واہ، سربراہ! ہم اور محمد دونوں روز روز تو نہیں ملتے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"اور تم بھی تو روز روز اپنے محبوب ڈرائیور سے جدا نہیں ہوتے!"

"تمہاری بات واضح ہو گئی نوری، کچھ اور بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن آؤ، ہم ایک بات آپس میں طے کر لیں۔ ہم جام تبھی ٹکرائیں گے جب تم ایک ممتاز اسکریپر ڈرائیور کے طور پر تختۂ اعزاز پر جگہ پا لو گے۔"

نوری نے گہری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"سمجھ میں آ گیا۔ میرا دل کہتا ہے کہ جب نہر عظیم بن جائے گی، اس کے آس پاس انگور کے باغات لگائے جائیں گے، نہر کا پانی پی کر انگور تیار ہوں گے تب ہم اسی انگور کی شراب کے جام آپس میں ٹکرائیں گے۔ ٹھیک ہے۔ میں صبر کروں گا۔ مجھ میں صبر و تحمل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اتنے دنوں تک بابالی آغا کے ساتھ جو رہا ہوں..."

"خدا کرے کہ نوری کی بکواس ہی کی طرح نہر میں بھی ہمیشہ پانی رہے!" بابالی نے اسی انداز میں کہا اور پھر محمد کی طرف مڑ کر پوچھا:

"اچھا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ تم شاید یونہی نہیں آئے ہو؟"

آکر اس کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اس لئے مجبوراً دوپہر کا کھانا گھر ھی پر کھانے لگا۔ ویسے اس کے لئے کھانا طعامخانے ھی سے لایا جاتا تھا۔

مگر وہ گھر تک بھی آسانی سے نہیں پہنچ پاتا تھا۔ راستے میں لوگ بار بار روک لیتے تھے۔ پروجیکٹ میں کام بہت تھے اور قدم قدم پر کوئی نہ کوئی سوال، کوئی نہ کوئی الجھن پیدا ھوتی ھی رہتی تھی...

گھر پہنچ‌کر بابالی نے نوری کو میز کے پاس بٹھا دیا اور کہا:

"نوری خان! تم یقین کرو کہ میں تم کو ھمیشہ اپنا سب سے معزز مہمان سمجھتا ھوں۔ اور میں چاھتا ھوں کہ ھماری یہ دوستی اور بھی گہری ھو جائے!"

وہ دونوں کھانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن کاش لوگ جن کو بابالی کے مشورے اور مدد کی ضرورت رہتی تھی، اسے کم از کم گھر میں اس کے حال پر چھوڑ دیتے۔ ان لوگوں نے ابھی کھانا کھانا ھی شروع کیا تھا کہ محمد نام کا ایک ٹیم لیڈر جس کی ٹیم یہیں رحمیت سیکٹر کے نزدیک کام کر رھی تھی، کمرے میں داخل ھوا۔ بابالی اور محمد علیک سلیک کرکے ایک دوسرے کی مزاج‌پرسی کرنے لگے جس کا سلسلہ ختم ھوتے ھی نوری جو اسی کا بےتابی سے انتظار کر رھا تھا، بول اٹھا:

"سربراہ! کھانا تو بہت اچھا ھے لیکن کسی چیز کی ذرا کمی محسوس ھو رھی ھے..."

"ارے نوری‌خان! تمہیں کس چیز کی کمی

"ھوں... کون ھے یہ؟ کسی سے بہت ملتا جلتا ھے۔ لیکن کس سے؟"

نووارد نے کچھ کہنا چاھا لیکن بابالی نے ھاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا اور کہا:

"تم ذرا ٹھہرو!.. ذرا دیر مجھے سوچنے دو۔" وہ اپنا ماتھا سکیڑکر تھوڑی دیر تک سوچتا رھا اور پھر بولا: "اف! میں یوزیک* کے کھیل میں ذرا کمزور ھوں۔"

محمد کو اس پر ترس آ گیا، بولا:

"ارے اپنے اوپر جبر کیوں کر رھے ھو؟ جب یہ ایک چھوٹا لڑکا تھا تبھی تم نے اس کو دیکھا ھوگا۔ ارے انام‌چاری ھے، گندیم آغا کا پوتا۔"

بابالی نے مہمان سے مخاطب ھوکر کہا:

"آؤ بیٹھو، انام۔ اپنا ھی گھر سمجھو۔ تمہیں گاؤں سے چلے کتنے دن ھوئے؟"

"میں سیدھا وھیں سے آ رھا ھوں۔"

"وھاں کے کیا رنگ ڈھنگ ھیں؟ میرے والد کیسے ھیں؟"

"سب ٹھیک ھے۔ اور آرتیق آغا کو کوئی بانکا جوان ھی سمجھئے!"

"تم ھمارے پروجیکٹ کو دیکھنے آئے ھو کیا؟"

"نہیں، بابالی آغا، دیکھنے نہیں کام کرنے آیا ھوں۔

---

* چھلے سے کھیلا جانےوالا ایک کھیل۔ اس میں ڈھونڈنا ھوتا ھے کہ چھلا کس کے پاس ھے۔

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے اس وقت ایکسکویٹر چلانےوالے کسی آدمی کی بہت ضرورت ہے۔"

"خوب... اسکریپر چلانےوالے کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہو پایا تھا کہ ادھر ایکسکویٹر ڈرائیور کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک الجھن کے دور ہوتے ہی دوسری الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ ہونہہ... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ہاں ایکسکویٹر بےکار کھڑا ہے؟"

"ابھی تو بےکار نہیں کھڑا ہے۔"

"کون چلا رہا ہے اس کو؟"

"میں ہی چلا رہا ہوں۔"

"تو کیا تم ایک ساتھ دو آدمیوں کا کام کر رہے ہو؟ ہوں..."

وہ کھانا کھا چکے اور نوری میز پر سے برتن اٹھانے لگا۔ اتنے میں بابالی کے ہاں ایک اور مہمان آ گیا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا — سانولی سی رنگت، اکہرا بدن، کالی کالی کچھ بھینگی سی آنکھیں اور چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں۔ اس نے دروازے پر رک‌کر سب کو سلام کیا۔ بابالی تھوڑی دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر محمد سے مخاطب ہوکر کہا:

"ارے میں تو اس لڑکے کو جانتا ہوں۔ لیکن کسی طرح یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے کہاں دیکھا تھا۔ کہیں اتفاقاً اس سے تمہاری جان پہچان تو نہیں ہے؟"

"اتفاقاً تو کوئی جان پہچان نہیں ہے لیکن ویسے میں اس کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ تو ہمارے ہی گاؤں کا ہے۔"

ادھر گھومنے پھرنے کی بات تو بےشک زیادہ خوش آئند ہے... لیکن یہ بات بھی ہے کہ محمد کو ایکسکویٹر چلانےوالے کسی آدمی کی سچ مچ بڑی ضرورت ہے۔ چنانچہ انام! بھئی تم بڑے وقت سے آئے ہو۔ محمد کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"یہ کام مجھ سے ہو بھی سکےگا؟" انام نے شک ظاہر کیا۔ "مجھے تو صرف موٹر چلانا ہی آتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں" بابالی نے تسلی دی۔ "محمد تمہیں یہ کام سکھا دیں گے۔ یہ شروع شروع میں تمہاری مدد بھی کریں گے۔"

"بابالی آغا..." انام نے کچھ ھچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں اکیلا نہیں آیا ہوں..."

"اور بھی اچھا ہے" بابالی نے ٹوک کر کہا۔ "کیا تمہارا ساتھی بھی ڈرائیور ہے؟"

"بابالی آغا، میں تو اپنی والدہ کو ساتھ لایا ہوں۔"

"واہ بھئی انام! کتنا اچھا کام کیا ہے تم نے!" محمد نے اس کے کندھے پر ایک تھپکی دےکر کہا۔ "بوستان خالہ تو ٹیم کے ارکان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوں گی۔ ہم تو اپنی ماں کی طرح ان کی آؤبھگت کریں گے۔ واہ! کتنے عمدہ کھانے پکاتی ہیں وہ!"

"تمہیں تو بس اپنی ٹیم ہی کی فکر ہے" بابالی نے اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ سوچتے ہی نہیں کہ ریگستان میں بوستان خالہ پر کیا بیتےگی۔ وہ تو نہ اپنی جوانی پر فخر کر سکتی ہیں

آپ کے والد صاحب ھی نے مجھے اس کی ترغیب دی اور انھوں نے ھی ترخان‌ماوی سے کہہ سن‌کر مجھے فارم سے یہاں آنے کی اجازت دلا دی ھے" انام چاری نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے سلیقے سے تہ کیا ھوا ایک کاغذ نکالا اور اسے بابالی کی طرف بڑھاتے ھوئے بولا: "یہ رہا فارم کے بورڈ کا دیا ھوا کاغذ۔ اور یہ ھیں میرے کام اور کردار وغیرہ سے متعلق دوسرے کاغذات..."

بابالی نے کاغذات کو بہت غور سے پڑھا، مسرت بھری نظروں سے انام کی طرف دیکھا اور پرجوش انداز میں کہا:

"ارے انام! تم تو موٹر ڈرائیور ھو، ایں؟"

"جی ھاں۔ میں فارم میں ٹرک چلاتا رہا ھوں" انام نے جواب دیا۔

نوری نے جھٹ سے بابالی کو مشورہ دیا:

"واہ! رکھو اسے اپنے ھاں۔ تمہاری "گازیک" کو سنبھالے۔ اپنے گاؤں کا بھی ھے۔"

"ارے نوری!" محمد جلدی سے کہہ اٹھا۔ "تم چپ رھو، نہ بابالی کو لالچ دو نہ انام کو۔ انام تو میری ٹیم میں جاکر ایکسکویٹر چلائےگا۔ بولو راضی ھو انام؟ جب زیادہ مشکل اور زیادہ باعزت کام موجود ھے تو آخر تم آسان کام کیوں کرو؟"

انام نے سوالیہ نظروں سے بابالی کی طرف دیکھا جس نے ھتھیلی سے اپنے گال کو سہلاتے ھوئے کہا:

"اپنے گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ کار میں ادھر

کیا؟ میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں‌گی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں اپنی بات پر اڑا ہوا ہوں تو وہ خود میرے ساتھ آنے کی تیاری کرنے لگیں...“

”کتنے خوش‌قسمت ہو تم، انام!“ نوری نے ایک ٹھنڈی سانس بھرکر کہا۔ ”جب بھی کام سے گھر واپس آؤگے تو شام کا کھانا تیار ملےگا، دیگچی سے چکنے سے لقمے کی پیاری خوشبو آ رہی ہوگی۔“ اس خوشبو کے تصور سے اس نے بڑی حسرت سے آنکھیں اوپر اٹھاکر ٹھنڈی سانس بھری اور کہا: ”اور نوری تو اس وقت اپنی اسکریپر مشین کے پہیے سے لگا کھڑا ہوگا، سوکھی روٹی کو دھول مٹی سمیت چبا چبا کر گدلے پانی کی مدد سے اپنے حلق کے نیچے اتار رہا ہوگا۔“

لیکن نوری کو اپنے اس پسندیدہ موضوع پر زیادہ بولنے کا موقع نہ ملا۔ بابالی نے اس کو ٹوک‌کر انام سے پوچھا:

”مگر بوستان خالہ اس وقت ہیں کہاں؟“

”وہ اسٹیشن پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ میرا انتظار کر رہی ہیں“ انام نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں آپ کو کب اور کہاں ڈھونڈ پاؤں‌گا۔“

بابالی نے محمد کی طرف مڑکر کہا:

”محمد! تم ماں بیٹے دونوں کے لئے بندوبست کر دینا۔“ پھر انام سے مخاطب ہوا: ”تو انام! بھئی نئے مقام پر تمہیں کامیابی نصیب ہو!“

نه هی اپنی صحت پر۔ تم پہلوانوں کی بات الگ ہے جنہیں کسی بات کی بھی پروا نہیں!"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ میری ٹیم کے لوگ سب کے سب پہلوان ہیں؟ یہ تمہاری بھول ہے" محمد نے اعتراض کیا۔ "مرینا چیرنووا بھی پہلوان ہیں کیا؟ وہ گومیل سے آئی ہیں۔ اور اتنی نازک ہیں کہ بالکل ساغر جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال وہ کوئی ماسٹر آف اسپورٹس تھوڑی ہیں۔ پھر بھی نہ کبھی روتی ہیں نہ ہی کبھی کسی بات کی شکایت کرتی ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ریگستان میں رہنے کی وہ عادی نہیں ہیں۔ پھر یہاں ان کی کوئی سہیلی بھی نہیں ہے۔ اور بوستان خالہ ان کی سرپرستی کریں گی۔ دونوں ساتھ رہیں گی تو بےشک زندگی زیادہ خوشگوار ہو جائے گی۔"

"کون جانے۔ شاید تمہاری بات ہی صحیح ہو..." بابالی نے کہا۔

انام نے بھی ہچکچاتے ہوئے کہا:

"بہتر ہے کہ والدہ میرے ساتھ ہی رہیں۔ محمد ہی کی ٹیم میں۔ انہوں نے خود ہی کہا ہے کہ جہاں تم رہوگے وہیں میں بھی رہوں گی۔ ماں ہی تو ہیں۔ اور پھر میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں" وہ جیسے بوستان خالہ کی صفائی پیش کر رہا تھا... "پہلے تو وہ چاہتی ہی نہیں تھیں کہ میں گھر چھوڑکر کہیں کسی تعمیراتی پروجیکٹ پر چلا جاؤں۔ کہتی تھیں کہ کس شیطان نے تمہیں ورغلایا ہے؟ فارم میں کام کی کوئی کمی ہے

"بیٹھئے اباجان! اس کو اپنا ہی گھر تصور کیجئے۔ ارے آپ نے مجھ کو کیسے تلاش کر لیا؟"

آرتیق آغا ذرا مشکل کے ساتھ صوفے پر بیٹھے اور پھر جواب دیا:

"یہ دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ ایک نوجواں مجھ کو یہاں لاکر چھوڑ گیا۔"

بابالی اپنے والد کے بغل میں بیٹھ گیا اور جائزہ لینے کے انداز میں ان کی طرف دیکھ‌کر کہا:

"آپ تو اچانک ہی آ گئے۔ خط یا تار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دی۔"

"سوچا کہ اس طرح اچانک پہنچنے میں زیادہ مزہ آئےگا" والد نے جواب دیا۔

"پھر بھی اگر اطلاع دے دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ میں مناسب طور پر آپ کا استقبال کرتا۔"

"میں مہمان بن‌کر تھوڑی آیا ہوں۔ میں تو بیٹے، ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"ارے وہ کون‌سا ضروری کام ہے جس نے آپ کو یہاں آنے پر مجبور کیا ہے؟" بابالی نے ذرا چونک‌کر پوچھا۔ "گاؤں میں کچھ ہو گیا ہے کیا؟"

"گاؤں تو جوں کا توں کھڑا ہے۔ سب خیریت سے ہیں" والد نے تسلی دی۔ "بات تم سے تعلق رکھتی ہے۔"

"ہاں ہاں کہئے، اباجان! میں سن رہا ہوں۔"

آرتیق آغا صوفے پر ذرا تن‌کر بیٹھ گئے، کھانس‌کر گلا صاف کیا اور ذرا شاندار لہجے میں کہا:

دروازے پر کوئی بڑی اپنائیت کے ساتھ زور زور سے دستک دینے لگا۔ بابالی اپنے خیالوں میں اتنا غرق تھا کہ اس دستک کی طرف فوری طور پر اس کی توجه نه مبذول ہو سکی۔ جب یه آواز کانوں میں پڑی تو اس طرف مڑکر اونچی آواز میں کہا:

"اندر آ جائیے۔ دروازہ کھلا ہے!"

وقت بہت ہو چکا تھا اس لئے بابالی دل ہی دل میں بےوقت آئے ہوئے مہمان پر ذرا سا جھنجھلایا لیکن دروازے پر اپنے باپ کو دیکھکر اس کی یه جھنجھلاہٹ خوشی میں بدل گئی۔ آرتیق آغا دروازے پر اپنے دلی جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بہت ہی سنجیدہ صورت بنائے کھڑے تھے لیکن ان کے ہاتھ بیٹے کی طرف بڑھے ہوئے تھے... بابالی فوراً اٹھکر باپ کے پاس پہنچا اور ان کے گلے سے لگ گیا۔

جب روایتی مزاج پرسی سے فراغت ہو گئی تو آرتیق آغا بڑے غور سے اپنے بیٹے کے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ کمرے کی آرائش معمولی سی تھی۔ ایک پلنگ، ایک صوفه، ایک میز، کئی کرسیاں اور بس۔ اس وجه سے کمرہ کچھ زیادہ کشادہ معلوم ہو رہا تھا۔ فرش پر دری قالین کچھ بھی نه تھا۔

آرتیق آغا ابھی کمرے کا جائزہ لینے ہی میں مصروف تھے که بابالی نے میز پر سے اپنی محبوبه اجپ کے خط کو اٹھاکر اپنی جیب میں چھپا لیا اور پھر صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

حسن دیا ہے وہاں عقل و فراست بھی خوب عطا کی ہے۔ تمہاری والدہ اس کی ماں سے بات کر چکی ہیں۔ وہ لوگ راضی ہیں۔ اور وہ مجھ سے کہنے لگیں که..."

"کون کہنے لگا؟ نورمراد کی بیٹی که اس کی ماں؟"

"ارے تم اپنے باپ کو مت ٹوکا کرو! میری مراد تمہاری والدہ سے ہے۔ انہوں نے کہا که آپ فوراً بابالی کے پاس جائیے اور اس کو فوراً یہاں لے آئیے۔ ہم ٹال مٹول کئے بغیر جھٹ پٹ شادی کر دیں۔"

"ارے اباجان! کیا آپ کو معلوم ہے که جلدی کب کی جاتی ہے؟" بابالی نے کہا۔

"ہاں، ہاں، میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں خود تو کوئی جلدی نہیں ہے" آرتیق آغا نے جواب دیا۔ "تم کہیں اس دن کا انتظار تو نہیں کر رہے ہو جب تم سو سال کے ہو جاؤگے؟ ارے بیٹے! یقین کرو، تب تم شاید ہی کسی سے شادی کر سکو۔ اور ہم ماں باپ کے صبر کا پیمانہ تو اب لبریز ہو چکا ہے۔ ہم تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں که کب ہمارا بیٹا ہم پر عنایت کرکے اپنا گھر بسانے پر تیار ہوگا۔ تمہیں تو ہمارا شکرگزار ہونا چاہئے که تمہاری قسمت سنوارنے کا سارا بوجھ ہم نے اپنے اوپر لے لیا ہے۔"

آرتیق آغا کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی عیارانه چمک پیدا ہوئی لیکن بابالی کی نظر اس طرف نه

"بیٹے! میں تمہیں شادی کی دعوت دینے آیا ہوں۔"
"شادی کس کی ہو رہی ہے؟" بابالی نے سوال کیا۔
"میں کہہ چکا ہوں کہ بات تم سے تعلق رکھتی ہے" باپ نے جواب دیا۔ "شادی تمہاری ہی ہے۔"
"میں ٹھیک طرح نہیں سن پایا۔ ذرا پھر سے بتائیے، کس کی شادی ہے؟"
"تمہاری شادی! تمہاری!" آرتیق آغا نے اب کچھ جھنجھلاکر کہا۔ "ہم ماں باپ ہی کو اب تمہاری فکر کرنی پڑتی ہے۔ تمہیں خود یہ سب آتا ہی نہیں ہے۔ تمہاری والدہ کہتی رہتی ہیں کہ بابالی شادی کرنے کا وعدہ تو کرتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ میں کوئی لڑکی ہی نہیں۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں" آرتیق آغا نے ایک بار پھر کمرے پر نظریں دوڑائیں۔ "خود میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر ہاتھ پکڑکر تمہاری شادی نہ کر دی گئی تو تم عمر بھر کنوارے ہی رہوگے۔ اور ہمارے ہاں گاؤں میں ایک اچھی سی لڑکی تیار بیٹھی ہے۔ اس سے اچھی تو ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔"
بابالی نے کسی قسم کے اشتیاق یا بیزاری کا اظہار کئے بغیر مکمل بےپروائی سے پوچھا:
"کون ہے وہ؟"
"ارے وہی نورمراد کی بیٹی" والد نے بتایا۔ "تم اس کو جانتے ہو۔ لڑکی نہیں خزانہ ہی سمجھو۔ اس سال دسویں جماعت پاس کی ہے۔ الله نے اسے جہاں

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ماں کو تم پر بھروسہ نہیں رہ گیا ہے۔ سچ بتاؤ، منگیتر والی بات تم نے جھوٹ کہی تھی نا؟" باپ نے پوچھا۔

"ارے جھوٹ بولنے کی مجھے ایسی کیا پڑی تھی؟"

"بس یوں ہی ہم سے پیچھا چھڑانے کے لئے بولے ہوگے جھوٹ۔ نہیں بیٹے، ایسی من گھڑت باتوں سے پلاؤ نہیں پکایا جا سکتا۔ بس اب تم سفر کی تیاری کرو۔ کل ہی چل دیں گے اور کچھ ہی دنوں میں سارے گاؤں کو شادی کی دعوت دیں گے۔"

بابالی نے بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"اباجان! آپ مذاق کر رہے ہیں کیا؟"

"ارے مذاق کی کونسی بات ہے!" آرتیق آغا نے غصے سے کہا۔ "بات تو تمہاری قسمت کی اور ہم سب کے مستقبل کی ہو رہی ہے! بات ہماری آئندہ نسلوں کی ہو رہی ہے!"

"لیکن اباجان... مجھے تو سچ مچ ہی ایک دوسری لڑکی سے محبت ہے اور اسی سے شادی کرنے کا میرا ارادہ ہے۔"

"مجھے تو یقین نہیں ہوتا۔"

بابالی نے اجپ کا وہ خط نکالا اور اس کو پوری متانت کے ساتھ باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"یہ لیجئے ایک ٹھوس ثبوت۔ پڑھ کے دیکھئے۔"

آرتیق آغا نے اپنے دونوں ہاتھ انکار کے انداز میں ہلاتے ہوئے کہا:

گئی۔ اس نے ہتھیلی سے اپنے ایک گال کو سہلاتے ہوئے کہا:

"اباجان! کیا آپ کے خیال میں وہ زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا جب والدین اپنی اولاد کی طرف سے سب کچھ طے کیا کرتے تھے؟"

آرتیق آغا نے اسی انداز میں جواب دیا:

"میرا خیال یہ ہے بیٹے کہ وہ وقت ابھی نہ آیا ہے نہ انشاالله کبھی آئے گا جب انسان کو اولاد کی ضرورت نہ رہے۔ ایسی حالت پیدا ہو جائے تو نوعِ انسان ہی صفحہ ہستی سے مٹ جائے! مجھے امید ہے کہ تم یہ نہ چاہوگے، ایں؟"

بابالی کو یقین ہو گیا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اپنے دل کا راز کھول دے۔ اس نے کہا:

"میں شادی کے خلاف نہیں ہوں... میں تو بس نورمراد کی بیٹی سے شادی کرنے کے خلاف ہوں۔"

آرتیق آغا نے ایسی صورت بناکر جیسے بےحد تعجب ہوا ہو، کہا:

"ارے اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے خود ہی کسی کو پسند کر رکھا ہے؟"

"میں تو امی‌جان سے اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ ان سے وعدہ کیا تھا کہ اسی سال کے اندر اندر آپ کی بہو کو گھر لے آؤں گا" بابالی نے جواب دیا۔ اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ والدہ یہ سارا قصہ والد کو بتا چکی ہیں اور اسی لئے وہ یہاں آئے ہیں۔

"لیجئے، چائے پیجئے۔"

گرم گرم سبز چائے کا ایک گھونٹ پی‌کر آرتیق آغا نے متفکر انداز میں اپنا سر ھلاتے ھوئے کہا:

"ارے بیٹا! زندگی، محبت، گھربار - یہ سب تو ایسی باتیں ھیں جو کبھی ختم ھی نہیں ھوں‌گی۔ جب تک ھم جیتے رھیں‌گے تب تک ان باتوں پر سر کھپاتے رھیں‌گے۔ اچھا تو تمہاری منگیتر عشق‌آباد کی رھنےوالی ھے؟ اس کے باپ کا نام کیا ھے؟"

"مومی میرگین" بابالی نے جواب دیا۔

"اچھا؟.. مومی میرگین؟" آرتیق آغا بھویں سکیڑکر کچھ سوچنے لگے اور پوچھا: "وہ بوڑھے اسکول ماسٹر تو نہیں ھیں؟"

"جی ھاں، وہ اسکول ٹیچر ھیں۔ کیا آپ ان کو جانتے ھیں؟"

"ارے مومی میرگین کو میں کیسے نہ جانوں؟ وہ تو کیلیجر کے اماشا قبیلے سے تعلق رکھتے ھیں۔"

"خیر یہ باتیں تو مجھے معلوم نہیں ھیں۔ میں تو آبپاشی قبیلے کا آدمی ھوں اور اجپ علم طب قبیلے کی۔"

"کیا اس کا نام اجپ ھے؟ اور وہ ڈاکٹر ھے؟"

"یہی تو مصیبت ھے کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں ھیں۔ اباجان! بات یہ ھے کہ وہ میڈیکل انسٹی‌ٹیوٹ میں پڑھتی ھیں اور جلد ھی، سال رواں ھی میں ان کی پڑھائی مکمل ھو جائےگی اور ڈاکٹری کی سند مل جائےگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہیں میرے سیکٹر میں

"نہیں، نہیں، دوسروں کے خطوط پڑھنے کی مجھے عادت نہیں ھے۔ تم بس اتنا بتا دو کہ یہ خط کس کا ھے۔"

"میری منگیتر کا ھے، عشق‌آباد سے آیا ھے" بابالی نے جواب دیا۔

"اچھا وہ عشق‌آباد کی رھنےوالی ھے؟" آرتیق آغا نے بالکل انجان بن‌کر پوچھا۔ "اب اس نورمراد کی لڑکی کا کیا ھوگا؟ وہ تو تمہارے لئے ویسے ھی تڑپ رھی ھے جیسے زمین پانی کے لئے تڑپتی ھے۔"

باپ کے لب و لہجے میں مذاق کا جو شائبہ تھا اس کو نہ بھانپ‌کر بابالی آگ بگولا ھو گیا۔ اس نے کہا:

"میں نے کہا تھا کہ جلدبازی کا پھل کبھی اچھا نہیں ھوتا۔ آپ لوگوں نے یہ کھچڑی پکائی ھے تو آپ ھی اسے کھائیے۔ امی‌جان ھی اس کو اپنے ساتھ رکھ لیں، ان کا ھاتھ بٹایا کرے‌گی۔"

"واہ! تم چاھتے ھو کہ تمہارا باپ ھی نورمراد کی بیٹی کے ساتھ شادی کرے، ھوں... ذرا سوچنا پڑے‌گا..."

"یہ آپ کی مرضی ھے۔ رھی میری شادی کی بات تو آپ سمجھئے‌گا کہ یہ مسئلہ حل ھو چکا ھے۔"

اس دوران بابالی کے لئے چائے لائی گئی۔ اس نے دو پیالوں میں سبز چائے انڈیلی۔ ایک پیالہ والد کے آگے رکھا اور سر سے پیالے کی طرف اشارہ کرتے ھوئے کہا:

"بھلا مجھے آپ کا سا پوری ایک صدی کا تجربہ کہاں ہے؟"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو" وہ شاید دل ہی دل میں فیصلہ کر چکے تھے۔ "میں کل عشق آباد چلا جاؤں گا۔ جاکر میرگین ہی کے یہاں ٹھہروں گا۔ ہم آپس میں رشتےدار بننےوالے ہیں اسی لئے۔"

"لیکن اباجان! ممکن ہے ان کو اس بات کا گمان بھی نہ ہو کہ ہم رشتےدار بننےوالے ہیں۔ میں تو آج تک کبھی ان کے ہاں گیا بھی نہیں۔"

"اگر اجپ اپنے ماں باپ سے پیار کرتی ہوگی، ان کی عزت کرتی ہوگی تو وہ اس کے راز سے ضرور واقف ہوں گے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ میں اور میرگین دونوں پرانے دوست ہیں۔ اگر وہ خود ہمارے گاؤں میں آتے تو بتاؤ کس کے ہاں ٹھہرتے؟"

"جی... ضرور ہمارے ہاں قیام کرتے۔"

"یہی تو بات ہے۔ تو فیصلہ ہو گیا۔ میں میرگین کے ہاں جاؤں گا اور ہم دونوں بات طے کرکے تم لوگوں کی شادی کی تیاری شروع کر دیں گے۔ تم لوگ خود اتنی سستی جو دکھا رہے ہو۔"

"آپ اباجان، کچھ دن میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا۔"

"ارے بیٹے، میں تمہارے جتنا صبر و تحمل والا تھوڑی ہوں۔ کہتے ہیں کہ نیک ارادہ آدھا کام۔ دوسرے لوگ چاہے سمجھیں کہ آدھا کام ہو چکا ہے اور یہ

آکر ڈاکٹری کریں گی لیکن انسٹی ٹیوٹ والے انہیں کرامیت نیاز بھیج رہے ہیں۔ اجپ کا جو خط میں نے ابھی آپ کو دکھایا ہے، اسی میں یہ بات لکھی ہے۔"

"خیر اس الجھن کو تو سلجھایا جا سکتا ہے... تمہیں کسی ڈاکٹر کی ضرورت تو ہے نا؟"

"جی ہاں، ضرورت ہے اور کچھ دنوں میں وہ آ بھی جائے گا۔ انسٹی ٹیوٹ سے ایک اجپ ہی کو تھوڑی ڈاکٹری ملے گی۔ اور لوگ بھی تو ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ اگر ہم مہرے بدل دیں جیسا کہ شطرنج میں ہوتا ہے، تو کیسا رہے؟ وزارت صحت میں میرے کچھ دوست ہیں۔"

"اباجان! ایسا کرتے کچھ شرم سی آتی ہے۔ جس نوجوان کو میرے ہاں بھیجا جا رہا ہے وہ اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ ممکن ہے یہیں اس کی منگیتر بھی ہو..."

"کوئی بات نہیں۔ اگر یہاں اس کی منگیتر رہتی ہے اور وہ اپنے منگیتر سے محبت کرتی ہے تو اس کے پیچھے پیچھے دنیا کے دوسرے سرے تک بھی چلی جائے گی۔ لیکن اجپ کو یہاں، تمہارے ساتھ رہنا چاہئے۔"

"بڑی دشوار صورت حال ہے، اباجان..."

"ہاں دشوار تو ضرور ہے لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی بات نہیں۔ ارے یہ بھی کیا بات ہوئی کہ تم اتنے بڑے افسر ہو، اتنے لکھے پڑھے ہو پھر بھی اس سیدھے سادے سے مسئلے کو حل نہیں کر پاتے؟"

یہی بات پروجیکٹ والوں سے بتانے کے لئے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ گاؤں کا ایک آدمی شاید آ بھی گیا ہو گا۔۔۔"

"کون؟ انام؟ جی ہاں وہ مجھ سے مل چکا ہے۔"

"شاید جلد ہی باقی لوگ بھی آ جائیں گے اور تم یہاں کام کو ذرا اور تیز کرو نا۔ فارم والے پانی کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔"

"اباجان! آپ بڑی اچھی خبر لائے ہیں۔ ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔"

"میرے آنے کا ایک مقصد اور بھی ہے۔ میں تم سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ تھکو مت بیٹے! تمہیں ہر کام میں کامیابی نصیب ہو!"

جدیدترین مشینیں انسان کے مصمم عزم و ارادے کے تحت قراقم ریگستانوں کو بڑی تیزی کے ساتھ سر کرتی چلی جا رہی تھیں۔

جب وہ "گازیک" گاڑی جس پر پروجیکٹ کے چیف ڈائرکٹر نووچنکو، چیف انجینیر خانین اور سیکٹر نمبر ۳ کے انچارج بابالی آرتیقوف سوار تھے، کچے گندھے آٹے کی مانند چپچپی ریت پر چلتی ہوئی ایک اسکریپر کے پاس آکر رکی تو بھاری بھرکم جسم کا ایک آدمی اسکریپر سے نیچے ریت پر کود پڑا۔ اس کے چہرے اور لباس پر دھول کی ایک موٹی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے اعلا افسران سے خندہ پیشانی کے ساتھ بےجھجک مصافحے کئے، اپنی دھول سے اٹی ہوئی عینک

سمجھ کر مطمئن ہو جائیں لیکن میں کہوں گا کہ ابھی آدھا کام ہی ہو پایا ہے۔ اور اس کو پورا کئے بغیر مجھے چین نہ ملے گا۔"

آرتیق آغا نے چائے کے پیالے کو خالی کر دیا۔ ان کا چہرہ خوش تھا۔ پھر انہوں نے کہا:

"میں نے یہ اچھا ہی کیا کہ تم سے ملنے چلا آیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تم نے میری ایک پرانی آرزو کو پورا کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خبر سن کر تمہاری ماں بھی خوشی سے پھولی نہ سمائیں گی۔"

پھر انہوں نے مکارانہ انداز میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا: "اچھا یہ تو بتاؤ بیٹے، کیا تم نے سچ مچ یہ سوچا تھا کہ میں تمہاری شادی کرانے آیا ہوں؟"

"کیا... کیا آپ کی آمد کا یہ مقصد نہیں ہے؟"

"ارے تمہاری ماں نے بتا دیا تھا کہ تم شادی کرنے والے ہو۔ تم نے ان کی بات کی تائید کر دی۔ بس میں سمجھتا ہوں کہ میں راستے کی تکلیفیں برداشت کر کے تمہارے پاس جو آیا ہوں اس کے لئے تم نے مجھے ایک اچھا انعام دیا ہے۔ میں تو یہاں اس مقصد سے آیا ہوں کہ تمہیں ایک خبر سناؤں۔ ایک ایسی خبر جس سے تمہیں شاید خوشی ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے فارم والوں نے نہر کی تعمیر میں تم لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کا عہد کیا ہے۔ وہ اپنے کچھ لوگوں کو بھی کام کرنے کے لئے بھیجیں گے، اپنے ہاں سے رقم بھی فراہم کریں گے اور ساز و سامان بھی۔ انہوں نے

ڈالی تو حیرت و استعجاب سے ان کی بھویں چڑھ گئیں۔

"ارے یہ کیا ھے؟" انھوں نے موتدی سے مخاطب ھوکر پوچھا۔ "تم نہر کو طول کی طرف نہیں، عرض کی طرف کھود رھے ھو کیا؟"

"جی ھاں، بالکل یہی بات ھے، کامریڈ نوو‌چنکو!" موتدی نے جواب دیا۔

"تم سے ایسا کرنے کو کس نے کہا ھے؟" ڈائرکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کسی نے نہیں کہا ھے" اسکریپر ڈرائیور نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔ "یہ میں یوں ھی اپنے آپ کر رہا ھوں۔"

"اچھا؟ اپنے آپ کر رھے ھو! مطلب یہ ھے کہ تم نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ھے؟ کیا سیکٹر انچارج اور منتظم کار کو اس کا پتہ ھے؟"

"جی ھاں، کیوں نہیں؟ سیکٹر کے سبھی لوگوں کو یہ معلوم ھے۔"

"مطلب یہ ھے تمہاری اس من‌مانی کا سب کو علم ھے اور سب اس کی طرف سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ھیں؟"

"سرگئی گیراسیمووچ! سب لوگوں کو یہ یقین ھو چکا ھے کہ میرے اس نئے طریقے سے کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ھو رہا ھے۔"

"اگر یہ نیا طریقہ زیادہ موثر ھے تو اب تک مجھے کیوں اس کا کوئی علم نہیں ھوا؟"

اتاری اور آستین سے چہرے کا غبار پونچھا۔ تب کہیں جاکر بابالی کو پتہ چلا کہ اس کے سامنے موتدی نیازوف کھڑا ہے جس کے ساتھ وہ کام کر چکا تھا۔

"ارے موتدی! یہ تم ہو؟" بابالی نے قدرے تعجب اور خوشی کے ساتھ پوچھا۔

موتدی نے کھلے دل سے مسکراتے ہوئے کہا:

"کیوں، ریگستان نے میری صورت بالکل بدل دی ہے کیا؟"

"کوئی بات نہیں، موتدی" بابالی نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ تند و تیز ہوا کے پیچھے پیچھے پیاری پیاری بارش آتی ہے۔ بھئی تم یہی سمجھو کہ تمہارا یہ دوسرا لباس، مطلب ہے یہ گرد و غبار کا لباس صحرائے قراقم میں جلد ہی آنےوالی بہار کا پیامبر ہے! آخر تم دھول میں یوں ہی تھوڑی اٹ گئے ہو۔ یہ تو ریگستان سے لوہا لینے کا نتیجہ ہے۔"

"بالکل ٹھیک!" موتدی نے جواب دیا۔ "ریگستان تو جی جان سے مزاحمت کر رہا ہے لیکن جیت کس کی ہوگی، یہ ہم دیکھ لیں گے۔"

ریگستان پر حکم چلانےوالا یہ پہلوان جیسا آدمی نووچنکو کو بھی غالباً پسند آ گیا۔ انہوں نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"شاباش!"

اور جب انہوں نے موتدی کی اسکریپر پر نظر

"بس، بس" نووچنکو نے ٹوک دیا۔ "مجھے پہلے سے ھی معلوم تھا کہ آپ کون‌سا گیت الاپنے لگیں گے۔ میں نے آپ سے فضول ھی یہ سوال کیا۔" پھر وہ بابالی کی طرف مڑے:

"آپ کی کیا رائے ھے، بابالی آرتیقووچ؟"

"ایک کہاوت ھے کہ سو بار سننے سے ایک ھی بار دیکھنا بہتر ھے۔ میں نے ابھی موتدی کو اس طریقے پر کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن کچھ اندازہ لگا لیا ھے میں نے۔ میرے خیال میں موتدی کا یہ نیا طریقہ کار دلچسپی سے خالی نہیں ھے۔"

"مطلب ھے کہ آپ اس کے حق میں ھیں۔ تو اختلاف رائے پیدا ھو گیا۔ اس صورت میں بہتر ھوگا کہ موتدی خود ھی ھمیں اپنے ایجادکردہ نئے طریقے کی خوبی بتا دیں۔"

"سیدھی سی بات ھے، سیرگئی گیراسیمووچ!" موتدی نے وضاحت کی۔ اس نے اپنے فل‌بوٹ کی نوک سے ریت میں ایک نالی سی بنائی اور کہا: "فرض کیجئے کہ یہ نہر ھے۔ اگر میں اسکریپر نہر کی لمبائی میں چلاؤں گا تو مجھے تین کام کرنے پڑیں گے۔ ریت کو کریدنا ھوگا اور پھر اس کریدی ہوئی ریت کو دائیں اور بائیں ھٹانا ھوگا۔" یہ سب اس نے اپنے فل‌بوٹ کی نوک سے کرکے دکھایا۔ "اگر کھدائی نہر کی چوڑائی میں کی جائے تو یہ تینوں کام ایک ساتھ ھو جاتے ھیں۔ وقت بھی کم لگتا ھے اور طاقت بھی بچ جاتی ھے۔ اس طرح میں پچیس میٹر کی جگہ پچاس میٹر زمین کو کھود

موتدی نے شانے اچکاتے ہوئے کہا:
"شاید اس لئے کہ آپ ہمارے ہاں بہت کم آتے ہیں۔"

نووچنکو نے پروجیکٹ کے چیف انجینیر خانین کے کندھے سے اپنی مٹھی یوں لگاکر جیسے ان کا کوئی قصور ہو، کہا:

"سنا آپ نے؟ یہ کہتے ہیں کہ میں بہت کم آتا ہوں!"

"جی ہاں اور کیا!" موتدی نے کہا۔ "میں نے کرامیت نیاز سیکٹر میں آپ کو اس سے پہلے صرف ایک ہی بار دیکھا تھا۔ یعنی... میرا مطلب ہے، جہاں نہر کی تعمیر کا اصلی کام ہو رہا ہے وہاں۔"

نووچنکو ایک بار پھر چیف انجینیر سے مخاطب ہوئے:

"میرے خیال میں یہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہمیں آتے جاتے رہنا چاہئے ورنہ سب اپنی من‌مانی کرنا شروع کر دیں گے۔ موتدی کے اس نئے طریقے کے متعلق خود آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری؟.." خانین بغلیں جھانکنے لگے لیکن پھر سنبھل گئے اور ذرا فخریہ انداز میں تن‌کر کہا: "میں تو بہرحال کاٹنے سے پہلے سات بار ناپ‌کر دیکھ لینے کا قائل ہوں۔ اور کسی بھی نئے طریقہ کار کا اچھی طرح جائزہ لینا اور اس جائزے کے نتیجے کا مطالعہ کرنا اور ترمیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جان جوکھم میں ڈالنے سے پہلے تو..."

"خوب! بہت خوب!.. آپ لوگوں نے یہ بہت ھی اچھا کیا ورنہ جب تک پروجیکٹ کے رہنما آپ کی تجویز پر توجہ مبذول کرتے اور اس کو منظور کرتے تب تک آپ لوگوں کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا.. اور اب تو ھمیں ممتاز کارکنوں کی اس جدت‌پسندانہ تحریک کا خیرمقدم ھی کرنا باقی ھے اور بس۔ ھاں یہ تو بتائیے، آپ کو اس ایجاد کے لئے انعام ملا کہ نہیں؟"

موتدی نے بےپروائی سے اپنا ھاتھ جھٹک‌کر کہا:

"انعام کی کوئی فکر نہیں ھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ھے کہ نہر جلدی تیار ھو جائے۔"

"ارے بھئی نہیں" نووچنکو نے اعتراض کیا۔ "یہ ٹھیک نہیں ھے۔ آپ انعام کے مستحق ھوں تو کیوں نہ لیں؟ ڈائرکٹر فنڈ سے آپ کو گزشتہ تین مہینوں کی اجرت کے برابر رقم ملےگی۔ آپ کی بدولت ھمیں کثیر رقم کی بچت ھوئی ھے اور کتنا قیمتی وقت بچ گیا ھے۔ سو ھم کنجوسی کیوں کریں؟.."

موتدی بالکل فوجیوں‌والے انداز میں تن‌کر کھڑا ھو گیا اور اسی انداز میں کہا:

"سوویت یونین کی خدمت کرنے کے لئے تیار ھوں!"

بابالی ڈائرکٹر نووچنکو کی باتیں بڑے اشتیاق سے سن رہا تھا۔ اس آدمی کے بارے میں اس کی اب تک جو رائے تھی وہ بدل گئی تھی۔ اس کا دل اب اس آدمی کے لئے خلوص اور محبت سے سرشار ھو رہا تھا۔ ابھی کچھ ھی دن پہلے بابالی ڈائرکٹر کو بڑا بدمزاج، سنگ‌دل،

لیتا ہوں۔ یہ طریقہ جہاں پروجیکٹ کے لئے منفعت بخش ہے وہاں میرے لئے بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح سے میری تنخواہ میں دوگنا اضافہ ہو جاتا ہے۔"

نووچنکو موتدی کی باتیں سنتے ہوئے اتفاق کرنے کے انداز میں سر ہلاتے رہے۔ موتدی کی باتیں غالباً انہیں پسند آئیں۔ اور پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ جہاں موتدی نے اسکریپر چلایا ہے وہاں ایک گہری اور پولی سی نالی نہیں بلکہ ایک چوڑی سی، ہموار سی خندق بن گئی ہے۔ ڈائرکٹر نے اس بات کو اور بھی پسند کیا اور انہوں نے پہلےوالی سختی چھوڑکر نرم لہجے میں موتدی سے کہا:

"بھئی مجھے معاف کیجئےگا کہ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ پر من‌مانی کرنے کا الزام عائد کرنے لگا تھا۔ بابالی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ نے ایک مفید کام شروع کیا ہے۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ کیا کرامیت‌نیاز میں اس طریقے سے آپ اکیلے ہی کام کر رہے ہیں؟"

"نہیں تو..." موتدی نے جواب دیا۔ "بہت سے دوسرے اسکریپر ڈرائیور بھی میرے طریقے کو اپنا چکے ہیں۔"

یہ اقرار کرتے ہوئے کہ ڈائرکٹر کے پیٹھ پیچھے جدت‌پسندی کی ایک پوری تحریک شروع ہو چلی ہے، موتدی کو کچھ جھجک محسوس ہو رہی تھی لیکن ڈائرکٹر نے بہت خوش ہوکر کہا:

سارا ماحول مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور چرمراہٹ سے گونج رہا تھا۔ چاروں طرف گرد و غبار کا ایک گھنا کہرا سا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی یہاں پہلی بار آتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے قیامت کا دن آ گیا ہو...

کسی نووارد کی بات ہی کیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو یہ سب دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے، یہاں کے مناظر ناقابل فراموش تھے۔

پروجیکٹ کے چیف انجینیر خانین تک جو بری طرح مایوسی کے شکار تھے، پروجیکٹ کی عظمت، زبردست پیمانے پر ہونےوالے کاموں اور لوگوں کے جوش اور ولولے کو دیکھکر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ ڈائرکٹر کے ساتھ سارے سیکٹر میں گھومے، باتیں بہت کم کیں بس چپ‌چاپ سب کچھ دیکھتے اور لوگؤں کی باتیں سنتے رہے اور جب یہ لوگ آگے چلنے کے لئے گاڑی کی طرف مڑے تو انہوں نے آہستہ سے ڈائرکٹر کا ہاتھ پکڑکر ان سے کہا:

"سیرگئی گیراسیمووچ! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

ڈائرکٹر نے ان کی طرف کچھ حیرت کے ساتھ دیکھکر طنزیہ لہجے میں پوچھا:

"کیا آپ ایک بار پھر اپنے شبہات اور خدشات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں، سرگئی گیراسیمووچ" خانین نے کہا۔ "میں اس بات کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں

اپنی بات پر اڑا رهنےوالا، بات بےبات پر آگ بگولا هوکر اپنے ماتحتوں کو ڈانٹنے ڈپٹنےوالا آدمی تصور کرتا تھا لیکن اب پته چلا که اصلیت بالکل دوسری هے۔ اب بابالی نے دیکھا که نووچنکو بالکل ویسے هی هیں جیسا کسی بڑے پروجیکٹ کے رهنما کو هونا چاهئے، اپنے کام میں بڑی مہارت رکھنے اور اس کو پوری تندهی اور لگن سے انجام دینےوالے، کارکنوں کی پہل‌قدمی کے قدرداں، ان کو مناسب راسته بتانےوالے، سادہ‌مزاج، صبروتحمل‌والے، بات کو سمجھنےوالے اور موتدی جیسے جفاکش لوگوں کے ساتھ بڑا پرخلوص برتاؤ کرنےوالے...

ترکمانوں کی مہمان‌نوازی کی رو سے موتدی نے ڈائرکٹر نووچنکو اور ان کے ساتھیوں کو چائےنوشی اور دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت دی۔

نووچنکو دل هی دل میں ترکمان لوگوں کی اس فیاضانه عادت کے قائل تھے۔ لیکن اس وقت چائےنوشی کرنے لگتے تو موتدی کی اسکریپر پورے ایک گھنٹے کے لئے رک جاتی اور یه مہمانوں کے لئے بھی اور خود میزبان کے لئے بھی کچھ بدنامی کا باعث بن سکتا تھا۔ یہی سوچ‌کر نووچنکو نے بڑی نرمی اور ممنونیت کے ساتھ چائےنوشی سے انکار کر دیا اور آگے چلے۔

موتدی ان کے دل کی بات سمجھ گیا اور ان کے انکار سے ذرا بھی ناراض نه هوا۔ خوش هوکر مسکرایا اور ایک بار پھر اپنی مشین پر چڑھ‌کر کام میں لگ گیا۔

"اور اس میں برائی بھی کیا ہے، سیرگئی گیراسیمووچ؟.."

"برائی یہی ہے کہ ہم کام کرتے رہے ہیں، محنت کرتے رہے ہیں اور آپ لوگ بس ناپتے تولتے رہے اور ہمارے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش بھی کرتے رہے ہیں!"

"اور کیا آپ کے خیال میں ہونا یہ چاہئے تھا کہ میں آپ کی بات ہی پر یقین کر لیتا اور فوراً "ہپ ہپ ہرا" کا نعرہ لگا دیتا؟ آپ کوئی نیا سوٹ خریدنے کی بات تھوڑی کر رہے تھے۔ آپ تو قراقم کے ریگستان کو زیر کرنے جا رہے تھے! اور پھر ریگستان میں نہر بنانے کے مخالفین کی باتیں بھی بالکل کھوکھلی نہیں تھیں۔ ان کے پاس بھی تو کافی ٹھوس قسم کی دلیلیں موجود تھیں..."

"یہ باتیں میں خوب سن چکا ہوں" نووچنکو نے بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

خانین نے اپنی بات جاری رکھی:

"لیکن آج میں نے دیکھا ہے کہ لوگ کتنے جوش وخروش سے کام کر رہے ہیں، اس منصوبے کی کامیابی کا ان کو کتنا یقین ہے اور وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنے بےتاب ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے کہہ دیا ہے کہ ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے معجزے یقینی ہیں۔ یہ لوگ جس جانفشانی سے محنت کر رہے ہیں، ہاں ہاں میں اس کو جانفشانی ہی کہوں گا، میری بات کو سچ مانیےگا، سیرگئی

که آپ نے مجھے اپنے ساتھ لاکر یہ موقع دیا که یہاں جو معجزے هو رهے هیں ان کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔"

خانین کے منھ سے یہ بات سن‌کر نووچنکو هکا بکا سے هو گئے۔ انھوں نے کہا:

"ارے... یہ آپ کو آج یکایک کیا هو گیا؟ آپ تو اچانک بالکل دوسرا هی گیت الاپنے لگے!"

خانین نے ناراضگی سے کچھ منھ بناتے هوئے کہا:

"دیکھئے نا سیرگئی گیراسیمووچ... میں کوئی ایسا قدامت‌پرست نہیں هوں جسے کوئی نئی بات گوارہ نہ هو۔ بات بس یہ هے کہ صرف خیالی باتوں کو نہیں مانتا۔"

"کیا آپ اس نہر کی تعمیر کو محض خیالی بات سمجھتے هیں؟"

"م۔ م۔ میں... ایسا سمجھتا هوں۔ قراقم پر هاتھ اٹھانا تو ایک ایسی بات هے جس کو جلدی مان لینا ذرا مشکل هے۔ میں تو کسی بھی معاملے میں جلدی کرنے کا عادی نہیں هوں۔ ذرا احتیاط برتتا هوں، ذرا سوچ سمجھ‌کر رائے قائم کرتا هوں۔ اور یہ کوئی غیرفطری بات نہیں هے۔ میں جب تک سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا، اپنے هاتھوں سے نہیں چھو لیتا مجھے کسی منصوبے کی کامیابی کا یقین نہیں هو پاتا..."

"یعنی جب تک سات بار نہیں ناپ لیتے..."

بس کوئی گھڑی ہی سمجھو ان کی طبیعت کو۔ لیکن آج انھوں نے بھی مجھے سخت حیرت میں ڈال دیا اور ساتھ ہی بڑی مسرت بھی بخشی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اس گھڑی کی ٹک ٹک پر فوراً ہی یقین کر لوں یا کچھ دن اور دیکھوں کہ یہ کیسے چلتی ہے۔"

خانین پھر خفا ہو گئے۔ انھوں نے منھ لٹکاکر کہا:

"سیرگئی گیراسیمووچ! قسم لے لیجئے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے خلوص دل سے کہا ہے لیکن ہاں قسم کھانے سے کیا ہوتا ہے۔ کسی انسان کے اقوال کی تائید اس کے افعال و اعمال سے ہی ہوتی ہے۔"

"ارے واہ خانین!" نووچنکو نے بڑی ہمدردی سے خانین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور انھوں نے خانین کے دبلے پتلے کمزور سے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے دبا دیا۔

گیراسیمووچ، یہی آپ کے حق میں سب سے بڑی دلیل ھے۔ صرف آپ ھی کے حق میں نہیں بلکه ان تمام لوگوں کے حق میں جو نہرعظیم کے منصوبے کی حمایت میں آواز بلند کرتے رھے ھیں۔"

نووچنکو نے آنکھیں چمکاتے ھوئے بابالی کی طرف مڑکر پوچھا:

"بابالی! آپ کا کیا خیال ھے، ان کی باتوں میں کچھ خلوص بھی ھے؟"

"میرے خیال میں پورا خلوص ھے" بابالی نے جواب دیا۔

نووچنکو نے اپنا ھاتھ ان کے کندھے پر رکھکر کہا:

"تو بابالی! ذرا میرے ھاتھ میں چٹکی تو کاٹیے۔ کہیں ایسا نه ھو که میں خواب دیکھ رھا ھوں۔"

"نہیں سیرگئی گیراسیمووچ، یه خواب نہیں ھے" بابالی نے کچھ سنجیدگی اور کچھ مذاق کے ساتھ کہا۔ "ممکن ھے، یه ایک اور معجزه ھو۔"

"ھاں، بابالی واقعی معجزے رونما ھو رھے ھیں۔ مجھے ایسا محسوس ھو رھا ھے که میں نے آج کم سے کم دو معجزے دیکھے ھیں۔ بتائیے نا، موتدی کی چوڑائی‌والی بات معجزه نہیں ھے کیا؟ یه خود بھی تو ایک معجزه ھے۔ واه! کیسا آدمی ھے وه بھی! سنگ خاره ھے، چٹان ھے! کتنا دھن کا پکا اور بےلوث آدمی ھے! اگر میری ھزار جانیں ھوں تو میں ان سب کو بڑی بےفکری سے اس کے حوالے کر دوں۔ اور یه ھمارے خانین جو ھیں، یه تو بڑی نرالی طبیعت کے آدمی ھیں۔

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے متعلق آپ کی قیمتی رائے اور آئندہ مطبوعات کی تجاویز اور مشوروں کا بصد شکریہ خیرمقدم کرے گا۔

براہ کرم اپنے تبصرے اور مشورے مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے:

دارالاشاعت ترقی کی شاخ
۳۰۔ نوائی اسٹریٹ
تاشقند، سوویت یونین

Progress Publishers Branch
30, Navoi Street
Tashkent, USSR